

پھر دیکھ سکتے ہیں سرشتی

مصباح علی سید



پھر دیکھ تمناے روشنی

اونچی آوازیں کچھ دیر بعد آہستگی میں ڈھلتی چہ میگوئیوں سے موضوع ہی بدل گئیں۔ سب میں ایک ہلچل سی مچی تھی۔ خوشی، ولولہ اپنی جگہ صبح ہونے والی تقریب اپنی جگہ، کچھ جلدی سوئے کچھ دیر سے، لیکن وہ نہیں جانتی تھی رات کیسے کٹی، کس وقت وہ کمرے سے نکل کر کوریڈور سے ملحقہ لابی میں چلتی رہی پھر سامنے دیوار گیر شیشے کی ونڈو کے سامنے بیٹھ گئی۔ دماغ لاوے کی مانند پک کر اب ابلا ہی چاہتا تھا، رات درختوں سے زمین تک پھسلتی آرہی تھی، اندھیرے میں ڈوبا سبز لان سیاہی میں تحلیل ہو کر برجوں والی حویلی میں ڈھل گیا۔

سفید برجوں والی اونچی حویلی کی سارے علاقے میں کبھی ایسی دھاک تھی جیسے دو برجوں کے درمیانی فاصلے میں محرابوں کی نقاشی دور سے دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی محسوس ہوتی تھی مگر وقت نے بہت کچھ بدل دیا تھا۔ لڑائی جھگڑے کے نتیجے میں ہونے والے علاج معالجے پر بہت سی زمینوں کے ساتھ گھر کے فرد کا بھی صفایا ہوا۔ حویلی کا صرف نام رہ گیا تھا یا ایک خستہ عمارت۔ اب برجوں والی کے اندر صرف اوسط درجے کے لوگ رہ رہے تھے۔ محرابوں کے بیچ میں نصب سفید سیمنٹ کی پتیوں والی سیم زدہ جالی کے سامنے اس نے خود کو بیٹھے پایا۔ اس کی نگاہ مشرقی پہاڑ سے ڈھلوان کی جانب زمین پر تھی جہاں نئی عمارت کے ڈھانچے میں کہیں کہیں سے چھوٹے زرد

بلب جلتے دیکھائی دے رہے تھے، رات اتری آتی تھی لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ نگاہ کے سامنے سے شیشے کی ونڈو ہٹ گئی۔

وہاں دیودار، شیشم کے درختوں سے ڈھکی بل کھاتی سیاہ سڑک بچھی معمول سے زیادہ پرسکون دیکھائی دے رہی تھی۔ ہلکی پھلکی چہل قدمی اس کے دل میں کہیں اندر جگہ بنانے لگی۔ کچھ عرصہ پہلے یہ سڑک گہری اور سنسان سی تھی۔ دن کی روشنی میں اکادکا کوئی گزرتا وہ بھی چپ چاپ اپنے رستے پر۔ دور دور تک زندگی کی بل چل کا پتا نہیں تھا۔

ایک پرخطر سڑک، ایک طرف کھائی دوسری جانب پہاڑ، پہاڑوں کی طرف سفر مشکل ضرور ہے مگر طے ہو ہی جاتا ہے، کتنے اس کھائی کا لقمہ بنے، کچھ پہاڑوں سے ٹکرا کر مرے۔ چھوٹی سی زبان نکال کر نارنجی ہونٹوں پر پھرتے معدوم ہو گئی۔ یونہی خواہ مخوہ آج سڑک یاد آ گئی۔ حاجی نے کچھ دن پہلے بتایا تھا، ٹوٹی سڑک پر کئی سال بعد پچھلے ہفتے نیا تارکول بچھایا گیا ہے جس کی چمک گرد نے ابھی ماند نہیں کی، کبھی اس سڑک کے بچھنے پر نشیبی علاقے والے خاصے برہم ہوئے تھے، حالانکہ سڑک بننے سے علاقے میں ترقی ہوتی ہے، رابطے استوار ہوتے ہیں، روزگار ملتا ہے، سہولتیں ملتی ہیں، جوانوں کی سمجھ میں تو یہ بات آتی تھی مگر بوڑھوں نے تو ٹھیکے دار، مزدوروں کو اس قدر تنگ کیا تھا، جماتا تارکول اور پتھر اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر پھینکتے تھے، سب کا خیال تھا شاید بارش سے بہہ آنے والے پانی سے گھبرار ہے ہیں۔ امام دین جس کے کہے میں سب بوڑھوں میں ایک تھا بڑھا پے سے لرزتی آواز میں انوکھی بات کہہ گیا۔

”پانی کا کیا ہے، وہ تو نشیب میں آئے گا، سڑک سے نہ سہی پہاڑوں سے پھسل کر مگر صاحب سڑک پر چل کر جو نکل گیا، وہ پلٹ کر نہیں آنے والا، وہ پانی ہو یا اولاد، پانی تو زمین میں اتر کر سوکھ جاتا ہے، اولاد سوکھا کر زمین میں اتار دیتی ہے۔۔“

سب نے حیرت سے اس کے جھریوں سے بھرے چہرے کو دیکھا تھا، جہاں فکر تھی غم تھا۔

”میرے بیٹے جوان ہو رہے ہیں، اگر وہ اس پر چڑھ نکلے میرا بڑھا پا تو رل گیا، شہر نکل لے گا انہیں اور مجھے جدا کی۔۔“

امام دین کا یہ جملہ اس نے اپنے بڑوں سے سنا تھا اور بہت حیرت ہوئی تھی، بھلا شہر کسی کو کیسے نکل سکتا ہے، پھر امام دین کو روتے دیکھا سڑک کو بننے، وہ روتا جاتا، سڑک بنتی جاتی، پھر اس کا خدشہ پورا ہوا تھا، اس کا بیٹا سڑک پر چڑھ کر شہر نکل گیا تھا، آتا تھا کبھی کبھی، شروع میں مہینوں بعد پھر عید، شبِ برات سے ہوتی بات سالوں پر گئی، بیوی بچے سب ادھر ہی تھے امام دین کے ساتھ۔ شروع میں خرچہ بھی بھجتا تھا۔ کم کرتے کرتے بات ہی ختم کر دی۔ کوئی کہتا اس نے وہاں شادی کر لی، کوئی کہتا اس کا خون سفید ہو گیا۔

وقت گزرتا گیا، اس کی بیوی انتظار میں بوڑھی ہو گئی، بچے جوان، امام دین نے انہیں سڑک پر چڑھنے کے لیے فارغ چھوڑا ہی نہیں تھا، سکول تو کیا دیکھانا، س، ڈ، ک جیسا کوئی حرف لکھنے نہیں دیا، امروز خان کی زمینوں پر چھوڑتے زور دے کر کہا تھا، انہیں اتنی فرصت ہی نہ دینا سڑک لکھ تو کیا دیکھ بھی سکیں اور اب ان کا سوچ کر جھستہ کا دل بند مٹھی میں دھڑکا۔

”گل ریز چاچا، اینٹیں تو اپنے بچوں کو چڑھانے کے لیے رکھی جاتی ہیں، تم تو ان کے لیے دیوار ہی بنا گئے۔“

فیصلے میں آسانی ہو گئی۔ ہتھیلی کے کناروں سے سبز آنکھیں پونچھ کر واپس اپنے کمرے کی جانب بڑھی، ہر اٹھتا قدم پہلے سے زیادہ مضبوط لگا۔



بیم بیرہ بٹتے ہی ان کی کیب بڑے سے آہنی گیٹ سے اندر داخل ہوئی، چوڑی سی سلیٹی سڑک کے دونوں جانب بڑے بڑے ایسے گراؤنڈ تھے جن میں گھاس کہیں اونچا کہیں بالکل کچلا گیا تھا۔ کچلی گھاس کو مزید روندتے اسٹوڈنٹس کے گروہ کے گروہ تھے لڑکے لڑکیاں، کچھ نے سفید اور آل پین رکھے تھے۔ کچھ کہنیوں پر ڈالے اپنی دنیا میں مگن۔ کئی گروپس کی صورت بیٹھے تھے۔ کتابیں کھلیں تھیں اور کئی ہاتھ پاؤں کے مشابہہ ماڈلز پکڑے بیٹھے ایک دوسرے کو جانے کیا سمجھا رہے تھے۔ امروز خان نے ان سب پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔ انہیں خاصا معیوب لگا تھا لڑکے لڑکیوں کا اتنا فری انداز میں اکٹھے بیٹھنا۔ ان کی کیب ٹیکسی اسٹینڈ پر رکھی تو امروز خان نے اس سے پوچھا تھا۔

”پہلے جانا کہاں ہے کچھ پتا بھی ہے۔؟“

”ایڈمن آفس۔ یہ جمع کرونی ہے نا۔“

اس نے گاڑی سے اترتے ہاتھ میں پکڑی اپنے اور بجٹل ڈاکومنٹس کی فائل دکھائی تھی۔

”تمہیں یقین ہے تمہارے اصل ڈاکومنٹس پانچ سال ان کے پاس رہیں گے۔“

امروز خان کو خاصی حیرت ہو رہی تھی، پانچ سال میں کوئی بھی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ نجستہ پورے وثوق سے کہہ رہی تھی۔

”جی۔ ایم بی بی ایس کمپلیٹ ہونے تک، یہ اسٹوڈنٹ کی توجہ کی گارنٹی ہے۔“

ان کی ہر بات سے انجان زربخت دانت میں چادر کا پلو دبائے حیرت سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی، ایسے تعلیمی ادارے میں پہلی بار آنا ہوا تھا اور اسے کس نے پوچھنا تھا یہاں آتے ہوئے اگر اس کے علاج کا خیال نہ ڈالا جاتا، پھر یہی ہوا چلو بہانے سے اس کا چیک اپ بھی ہو جائے گا، بہانے سے ہی سہی اس کا علاج ہو جائے گا۔ وہ بہت خوش تھی۔ ہر تھوڑی دیر بعد کوئی ایسبولینس ٹوں ٹوں سائرن بجاتی پاس سے گزرتی وہ اچھل جاتی۔

”اللہ رے۔ لگتا ہے کوئی لڑائی جھگڑا ہوا یا بم دھماکا، کیسے ایسبولینس آئے جارہی ہیں۔“

امراز نے مسکرتے ہوئے ناک سے مکھی اڑائی تھی۔

”یہ میڈیکل کالج ہے، یہاں ایسبولینس نہیں آئے گی تو کیا ہمارے پہاڑوں پر پھرے گی۔“

زربخت کو نجستہ کی فکر ہوئی تھی۔

”نجستہ! تمہیں یہاں ڈر تو بہت لگے گا۔“

”ڈرنے کی کیا بات ہے ہماری نجستہ بہت بہادر ہے۔“ نجستہ کی جگہ جواب امروز خان نے دیا۔ اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا، اسے کبھی بھی یہ یقین نہیں تھا اس کے اس شوق میں کم از کم اس کی اپنی فیملی ساتھ دے گی۔ جب اس نے پہلی بار یہ بات منہ سے نکالی۔

”مجھے ڈاکٹر بننا ہے۔“

خانی ماں تو ہنسی ہی تھیں۔ صفورا چاچی تھیک میں ہنس ہنس کر دوہری ہوتی گئیں۔

”مڑے (ارے) خانی تیری بیٹی نے دو نمبر کیا لے لیے، اس کا بھیجا پلٹ گیا۔ یہ ڈاکٹر بنے گا، لو کر لو بات ہم نے کبھی سکول نہیں دیکھا یہ ڈاکٹر بنے گا۔“

خانی ماں کو اس کے ارادوں سے خوف محسوس ہوا۔ وہ بچپن سے ایسی ہی تھی جو بات کہہ دی سواڑ گئی، پوری کروا کر دم لیتی تھی۔ سکول تک جانا، سہیلیوں سے مل لینا۔ یہاں تک تو بات درست تھی لیکن ڈاکٹر یعنی پڑھنے کے لیے دور شہر جانا۔ یہ تو ان کے لیے ایسے ہی تھا جیسے ایمان سے پھر جانا۔ وہ تو اس بات پر راضی نہیں تھیں۔ علاقے کے کالج سے انٹر ہی کر لے، بات سیف خان تک جا پہنچی۔



رات درود یوار پر پھسلتی حویلی کے اندر تک جا گھسی تھی، صنوبر کی سنہری لکڑی سے بنے بھاری سے صوفے پر سیف خان ٹیک لگائے بیٹھے قہوہ پی رہے تھے۔ کمرے میں قہوے کی گرمائش اور صنوبر کی مہک تب پھیلی جب جھمٹہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی سیف خان نے ہاتھ میں پکڑی پیالی ہتھی پر رکھتے اپنے مخصوص انداز میں پچکارا۔

”آؤ بیٹھو۔“

انہوں نے اپنے پاس اس کی جگہ بنائی تھی مگر وہ سامنے بیٹھ گئی۔ نگاہ پیالی میں لہرتے گرم قہوے پر تھی۔
 ”میں نے سنا ہے، گھر میں کوئی بات چل رہی ہے۔ کیا مسئلہ ہے؟“
 ”مسئلہ نہیں خواہش۔“ لہجہ ٹھوس تھا صنوبر جیسا مگر نگاہ میں ہلتے قہوے جیسی التجا سی تھی۔

”خواہشیں صرف مرد کی ہوتی ہیں۔ عورت تکمیل کے لیے ہوتی ہے بچے۔“ سیف خان کے اندر کاروائی پٹھان گرم ہوا تھا۔

”میں مان لیتی حاجی۔ اگر دل کی دھڑکن محسوس نہ کرتی، دماغ بار بار سوچنے پر نہ اکساتا، کہ عورت دل رکھتی ہے، اس کے اندر احساسات پھوٹتے ہیں۔“

گہرا تاثر دیتے ہوئے سیف خان کی بھنوں کے کنارے آپس میں جڑ گئے تھے۔ آج سے پہلے کسی لڑکی کو ایسے بولتے سنا تھا نہ دیکھا تھا، اس سے پہلے وہ کچھ کہتے امروز لالہ اور درخزئی ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔

حاضر وقت مسئلہ جاننے میں انہیں زیادہ وقت نہیں لگا تھا کیونکہ کئی دن سے ایک بحث چل رہی تھی ”خجستہ کالج جانا چاہتی ہے اور یہ جا کر دم لے گی۔“ اس کا کالج جانے کا کہنا ایسا ہو گیا تھا جیسے اس نے لندن جانے کا کہہ دیا ہو۔ یہ ایک پہاڑ کی مسافت پر ڈگری کالج تھا، کئی برس پہلے جمال خان علاقے کے ضلعی ناظم بنے تھے تب ہی ووٹ لینے کے لیے علاقے میں بہت سے کام کروئے تھے۔ لڑکیوں کا ایک ڈگری کالج منظور کروا لیا۔ وقت کے ساتھ اسٹاف بھی آ گیا۔ اب تو اس جانب کافی رونق تھی سڑک بھی پکی ہو گئی تھی، کئی گھرانوں کی لڑکیاں کالج جانے لگیں تھیں لیکن برج حویلی سے ابھی کوئی نہیں گئی تھی۔ یہاں تھی بھی کون جو کالج جاتی۔

ایک زر بخت، دوسری خجستہ، جمال خان کی ناگہانی وفات نے سیف خان کو بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔ دنیا میں دوعی بھائی تھے۔ بھائی بھی ایسے محبت و خلوص میں پورے علاقے پر بھاری، اس طرح جڑے درمیان سے کوئی سوئی نہ گزار سکے، ایک ایک چیز میں یاد دہی تھی، پھر وارث بھی نہ چھوڑا، کوشش بہت کی تھی پر اللہ کو منظور نہیں تھا، منتیں، مرادیں، دانیوں مانیوں کے ٹوکے مگر توڑ نہ چڑھے، کچھ آدھ میں ختم، کچھ عین وقت پر، ڈاکٹر سے مشورہ شرم کی حد توڑنے کے مترادف تھا، گھریلو علاج سے خانی کو لونگ ضرور مل گیا تھا مگر بیٹا نہیں، جمال خان کے دل کا ملال اپنی جگہ مگر اظہار کبھی نہیں کیا تھا، کچھ شاکر سی طبیعت تھی، ماشاء اللہ بھائی کے دو چراغ تھے۔ سو گھر کے دروازے پر روشنی رہی۔ وقت گزرا کہ جمال خان بھی گزر گئے، ترکہ میں جائیداد کے ساتھ چھوڑیں دو بیٹیوں کو۔ دیکھ کر سیف اللہ کا دل بھر بھرا آتا تھا، جمال خان کی پہلی برسی پر زر بخت کا نکاح امروز خان سے کر کے زخمی دل پر مرہم رکھ لیا۔ زر بخت اس وقت دسویں میں تھی، امروز کو بی اے کیے بھی دو سال سے اوپر ہو چکے تھے، باپ کے ساتھ اپنا آبائی کام بہت خوشی سے کر رہا تھا، شادی کے وقت دونوں کی عمروں کا آٹھ نو سالہ فرق جو اس وقت محسوس بھی ہوا زر بخت نے خانی بیگم کی کاپی بن کر دو سالوں میں ہی مٹا دیا تھا۔

درختی شروع سے لا پرواہ جم کر بیٹھنے سے اوب جانے والا تھا، بمشکل ٹڈل کی تھی جب امروز لالہ بی اے کے بعد بھی پہاڑ کی کچھلی زمین پر باجرہ مکی اگر ہے ہیں تو اسے اگاتے شرم آئے گی؟ جب کرنا ہی یہی کام ہے تو بی اے جائے بھاڑ میں، آٹھویں کی کتابیں دوست کو تحفہ کر، خود زمینوں پر جانے لگا، زمینوں سے سارے علاقے میں گھومتا گھماتا کچھ سرچڑھا من موچی ٹائپ بن گیا، پورے گھر میں ایک خجستہ تھی باقاعدگی سے سکول جانے

والی۔ امروز لالہ اسے لاتے لے جاتے تھے، کبھی اگر درخزئی کو لانا پڑ جاتا تاں کبھویں چڑھاتا، سارے رستے گھوریاں نکال نکال سانس خشک رکھتا، کچھ عرصہ اس نے برداشت کیا آخر ایک دن سیف خان سے کہہ ہی دیا۔

”داجی! ہم درخزئی کے ساتھ نہیں جائے گا۔“

صفورا چاچی نے گھر کا، خانی بیگم برس ہی پڑیں۔

”کیوں نہیں جائے گا؟“

”کیونکہ یہ بہت غصہ کرتا ہے، ہمیں پہاڑ سے دھکا دے دے گا۔“

”آرام سے بات کرو۔“ خانی بیگم اونچی آواز میں بڑبڑائیں تھیں۔ ”اونہہ، پہاڑ سے دھکا دے دے گا۔ مالک ہے وہ تیرا۔“

بارہ تیرہ سالہ بچی کے منہ سے لفظ تو نہیں نکلے تھے البتہ بھولی سی سبز آنکھوں سے الجھن اڑتی تھی۔

”مالک تو جائیداد کے ہوتے ہیں، جانوروں کے ہوتے ہیں۔ مس کہتی ہے مالک اللہ ہوتا ہے، پر میرا مالک یہ ہے، یہ بدتمیز!“

خانی بیگم سے پھسل کر نگاہ فاصلے پر کھڑے درخزئی پر گئی تھی جس کی گردن مزید تن گئی تھی۔ ماتھے پر کرخنگی۔

بخستہ گھر کی سب سے چھوٹی بچی تھی اور سیف خان بہت مہربان، وہ اپنی نشست سے اٹھے۔ بہت پیار سے بولے تھے۔

”چلو آج سے ہم چھوڑنے جائے گا تمہیں۔“

دو چار سال کی بات تھی، پھر شادی کر دینی تھی سیف خان کو اس کی بات ماننا اچھا لگا تھا۔

پہاڑوں پر اترتی چڑھتی دھوپ نے سال بتاتے وقت نہیں لگایا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا سیاہ کڑھائی والی چادر میں لپٹی سر جھکائے چلتی لڑکی پورے علاقے میں ٹاپ کر جائے گی، حیرانی تھی اور بہت تھی اس سے زیادہ تب ہوئی جب اس نے کہا۔ وہ کالج جائے گی۔ چاچی اماں کو اس کی بات انتہائی احمقانہ لگی، خانی بیگم نے جھاڑ کر رکھ دیا۔ وہ شادی کا سامان دھڑ دھڑا کٹھا کیے بیٹھی تھیں اور وہ منہ سر کتابوں میں جھونکنے کی باتیں کر رہی ہے اور زربخت تو اس کے دسویں سے آگے پڑھنے پر ہی دم بخود تھی۔

”میری بھی تو شادی کر دی تھی، اس کی بھی ہونی چاہیے ورنہ چہرے کا نور کتنا ہیں چاٹ لیں گی، نہ بھولپن رہے گا نہ حسن۔“

نجستہ نے ان عورتوں میں سرکھپانے کے بجائے امروز لالہ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”آپ تو کہتے تھے ہم آپ کے بچوں کی طرح ہے۔ اگر آپ کی بیٹی پڑھنے کا کہتی تو نہ پڑھاتے۔“

امروز خان کی گہری نگاہیں اس کے چہرے پر گڑھی رہ گئی تھیں۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں، ایک تین سال کی، ایک چار کی، اس وقت اس کی چہرے میں ان کا بھولپن جھلکا تھا۔ نجستہ کے کندھے پیار سے تھپکے۔

”جو داجی فیصلہ کریں گے، ویسا ہوگا۔“

داجی سن کر کچھ دیر تو چپ رہے پھر تحمل سے پوچھا۔

”آگے پڑھ کر کیا کرو گی؟“

”ڈاکٹر..... ڈاکٹر بنوں گی۔“

خانی بیگم، صفورا چاچی اور زربخت کو تو سانپ سونگھ گیا تھا۔

”پہاڑ سے جو گرتے ہیں ہسپتال پہنچتے پہنچتے جان سے چلے جاتے ہیں، پہاڑ پر ہسپتال بناؤں گی، عورتوں کو اجازت نہیں مرد ڈاکٹر کے پاس جانے کی، لیڈی ڈاکٹر ہونی چاہیے ہماری عورتوں کے لیے۔“

وہ ایسے وجد میں بولی تھی جیسے پہاڑ چشیل میدان میں ڈھل بھی گیا ہو اور ہسپتال کی عمارت اونچی ہوئی جاتی ہو، داجی کو امروز نے اشارے سے چپ رہنے کا کہا تھا۔

”انٹر کا کیا ہے کر لینے دو، اب تو علاقے کی کئی لڑکیاں کالج جا رہی ہیں۔ رہی بات ڈاکٹر بننے کی، وہ بننا اتنا آسان نہیں جیسا میٹرک میں ٹاپ کرنا، ابھی تازہ تازہ خبریں سنی تھیں میڈیکل کا میرٹ آسمان سے باتیں کرنے لگا ہے۔ ہر سال اونچا چمپ، بچوں کا رونا پیٹنا، احتجاج، توڑ پھوڑ، خودکشی و خودسوزی کی کوشش، بورڈ کے ٹاپر رہ جاتے ہیں یہ تو پھر علاقے کی ہے۔ پھر انکار کر کے اس میں بغاوت ضرور بھرنی ہے۔“ داجی نے ناچاہتے ہوئے نیم رضامندی دے دی تھی مگر درختی ہتھ سے اکھڑ رہا تھا۔

”آج کالج جانے کا کہہ رہی ہے، کل شہر جا کر پڑھنے کا کہے گی۔ لوگ ہم کو باتیں ماریں گے۔“

چادر ماتھے تک کھینچتی جختہ اس کے پاس سے گزرتے گزرتے آہستگی سے کہہ گئی۔
 ”ڈنڈے تو نہیں ماریں گے۔“

”دیکھا دیکھا داجی، ابھی سے کتنی زبان ہے اس کی۔ کل کو اور آگے سے چلانے لگے گی۔“
 کمرے کی جانب بڑھتے جختہ کے قدم اس کے جملوں پر رکے، پلٹ کر آئی اور مستحکم انداز میں کہا تھا۔
 ”پڑھوں گی تو قلم چلے گا، زبان رک جائے گی۔“

درخزئی نے نخوت سے گھورا تھا۔ اس کی ایک فیصد مرضی بھی نہیں تھی کہ وہ مزید آگے پڑھے، ہر ممکن احتجاج کیا تھا لیکن امروز لالہ نے اس کے غصے کو نرمی سے قابو کر لیا تھا۔



اس کا ڈگری کالج میں پہلا دن تھا اور جختہ نے ذہن پر ایسے سوار کر رکھا تھا جیسے اس کا پہلا امتحان ہو۔ ایک ایک چیز بیگ میں موجود ہونے کے باوجود کوئی دس بار اٹھا اٹھ کر بیگ چیک کیا تھا، پھر یہ معمول بن گیا۔ رات کو ہر چیز تیار کر تسلی سے سرہانے رکھتی تھی۔ اسے پتا تھا اس کام میں اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہے۔
 عام طور پر بچوں کی چیزیں مائیں تیار کر کے رات کو سوتی ہیں لیکن خانی بیگم اس حق میں ہی نہیں تھیں کہ وہ پڑھے۔ انہیں یہی فکر تھی کہیں پڑھائی اس کا دماغ اونچا ہی نہ کر دے ہم میں، ہماری روایات میں نقص نکالنے لگے، صرف داجی یا امروز ہی تھے جنہوں نے ڈرتے ڈرتے مگر اسے داخلہ دلوا دیا تھا۔ جختہ کے لیے یہی بہت تھا اپنی چیز کا خیال وہ خود ٹھیک سے رکھ سکتی تھی۔ اپنی کتاب، قلم قدر کے ساتھ بیگ میں رکھ کسی مقدس چیز کی طرح بیگ سینے سے لگائے ہزاروں دیپ تھے جنہیں آنکھوں میں جلا کر چوکھٹ پار کرتی تھی۔

وہ امروز لالہ یا داجی کے ساتھ ہی کالج آتی جاتی، بہار سردی گرمی، بارش طوفان اسے کسی چیز سے غرض نہیں تھی بس اسے نمبر چاہئیں تھے۔ اتنے کے اس کا داخلہ میڈیکل کالج میں ہو جائے، اسے اتنا پتا تھا پرائیوٹ میڈیکل کے لیے اس پر کوئی پچاس ساٹھ لاکھ خرچ نہیں کرنے والا اور کرتے بھی کہاں سے، گھر کا ساز و سامان بیچتے یا خود کو.....؟ جو کرنا ہے اسے اپنی محنت کے بل پر کرنا ہے۔

اس کی محنت پر ہی درخزئی کو بل پڑتے تھے، کوئی حربہ نہیں چھوڑا تھا اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کا۔ کاغذ کی

ضرورت ہو تو دھڑ دھڑ اس کی کتابیں پھاڑ لیتا، قلم پیانہ چاہیے، خجستہ کا بیگ حاضر، اسے پڑھائی میں مصروف دیکھ کر اسے اپنی مصروفیات یاد آ جاتیں، کمرے میں وہ دھماچوکڑی مچاتا۔ صاف کرنے والے کے کئی گھنٹے برباد ہو جاتے، زر بخت بچیوں کے کام اور گھر کے کھانے پکانے کا کرتے کرتے ہی تھک جاتی تھی، دوسری بیٹی کے بعد سے اس کی صحت کچھ گرتی جا رہی تھی، علاقے کی ایل ایچ وی سے دوالی جاتی، کچھ دیر کو فرق پڑ جاتا لیکن بھاری کام کرنے سے گردے کی جگہ بہت درد کرتی تھی اسی لیے صفائی ستھرائی کا سارا کام خجستہ کے سر تھا، کالج جانے سے پہلے ضروری ضروری سمیٹ جاتی، آتے ہی گھر الٹا ملتا تھا، ہر جگہ درخزئی کی چیزیں، جو کمرے کی حالت تھی وہ تو الایماں، وقت کی کمی کا بہانہ اس نے اس خوف سے نہیں رویا۔ وقت نکالنے کے لیے اسے کالج سے نکلوا لیا جاتا۔



ایک دن صفورا چاچی کو ہی خیال آیا تھا۔ وہ بھی اس لیے کئی دن سے دیکھ رہی تھیں کہ وہ کالج سے تھکی تھکی آتی ہے۔ کھانا کھا کر کام میں لگ جاتی ہے، کئی بار محسوس کیا اپنا ماتھا، کن پٹیاں پوروں سے آہستہ آہستہ سہلا رہی ہوتی تھیں۔

”تھک گئی تو رہنے دے، ٹھہر کر ہو جائے گا۔ آتے ہی لگ جاتی ہے۔“
اس نے فوراً ہاتھ نیچے کر لیے۔

”نہیں چاچی، ویسے ہی بس۔ شام کو تو پڑھنا بھی ہوگا۔“

”ایک تو تجھے پڑھنا لے ڈوبے گا۔ لعنت بھیج ایسے پڑھنے پر، جوانی میں سر دکھنے لگے۔“

خجستہ نے لعنت اپنے سر درد پر بھیجی اور کام میں لگ گئی، اس کے شوق پر دل کچھ پیجا بھی تھا تو درخزئی سے چاچی نے کہہ ہی دیا۔

”گلتا ہے تو گھر میں رہنا بھول گیا۔ تجھے اصطبل بھوادوں۔“

اس نے نا سمجھی سے ماں کو دیکھا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب کیا۔“

انہوں نے فرش سے بکھری چیزیں اٹھاتے ہوئے اسے گھور گھور کر دیکھا تھا۔

”جہاں بیٹھا وہیں کھایا، ادھر گرا ادھر گرا۔ کپڑے جوتے چادر سب بکھیر رکھا ہی، کوئی عقل نامی چیز ہے تجھ میں یا گھوڑوں کی طرح گھاس کھائی دم ہلائی۔“

ماں کی ضرب المثال پر تو کھول کر رہ گیا۔

”گھر کی عورتیں مر گئی ہیں کیا۔ کریں کام۔“

اس نے بال بنا کر کنگھا بیڈ پر اچھال دیا۔

”مری نہیں، بوڑھی ہو گئی ہیں۔ نہیں دم رہا اب ہڈیوں میں اتنا، خواخواہ کا گند سمیٹوں۔“ اس کے بیڈ سے کنگھا اٹھاتے اسے ایک بار پھر نخوت سے دیکھا تھا۔

”جو جوان ہے اس سے کیوں نہیں کروا تیں۔ بٹھاؤ گھر اسے، بلا وجہ تماشا لگا رکھا ہے۔“

گردن جھٹکتے ہوئے گرم مفلر گردن کے گرد لپیٹا، دانتوں تلے آئے کڑوے بادام جیسا منہ بناتے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ درتچے کے آخری کونے میں انگلیٹھی کے پاس بیٹھی وہ ہل ہل کر اپنا سبق یاد کر رہی تھی، انگلیٹھی کا سارا سیک درخزئی میں بھر گیا۔ دانت کچکاچاتا اس کے قریب ہوا، اسے اور اس کی کتابوں کو غفر سے دیکھا تھا۔

”کیا سمجھتی ہے، چار لفظ پڑھ کر ہم پر حکومت کر لے گی۔“

سبز آنکھوں میں ساری بے بسی اتر آئی تھی۔

”حکومت کرنے کے لیے تو حمایت کا ہونا ضروری ہے۔ میرے ساتھ تو کوئی حمایت نہیں۔ میں تو خدمت کرنا چاہتی ہوں۔“

”ہونہہ خدمت۔ خدمت تو تجھ سے ایسی لوں گا تو ان کاغذوں کو دیکھ دیکھ کر روئے گی۔“

وہ اس کی چوکی کوٹھوکر مارتا باہر نکل گیا، اوس میں ڈوبی سبز آنکھیں اس کی پشت دیکھتی رہ گئی تھیں، سبز سر کا درتچے کی جالی سے دکھائی دیتے ٹھنڈے خالی آسمان پر ٹھہر گیا۔

”خواہشوں کو تکمیل کا رنگ تو اللہ چڑھاتا ہے، انسان کی کیا اوقات۔“



سبز پتوں پر ٹپ ٹپ برس کر پھسلتی بوندوں کی طرح دن سنگلاخ پتھروں میں جذب ہوتے جاتے تھے، سال اول کا نتیجہ بہت زبردست رہا تھا، سہیلیوں کی آنکھیں پھیل گئیں، استادوں کا مان بڑھ گیا تھا۔ جہاں بخشہ کی امید بڑھی تھی وہاں سر کا درد بھی بڑھ گیا تھا، تختہ سیاہ پر لکھے سفید لفظ کہر کی طرح مٹے مٹے لگتے۔ آنکھیں چند ہی چند ہیا کر غور کرتی، کن پٹیوں پر زور پڑتا، بار بار نشست سے اٹھ کر جاتی، کا پی پر اتار لاتی۔ ایک دن مس نے کہہ ہی دیا۔

”بخشتہ! تمہیں آنکھیں چپک کر دانی چاہئیں، تمہاری نگاہ کا مسئلہ ہے۔“

”نہیں نہیں مس۔“

اسے مس کے جملے سے بھی خوف آیا تھا۔ صرف یہ سوچ کر کہیں یہ سچ نہ ہو جائے، پھر تو گھر والے اس کی کسی صورت نہیں مانیں گے۔ رات کو خانی بیگم کمرے کا بلب جلانے نہیں دیتی تھی۔ اسے روشنی میں نیند نہیں آتی تھی ناں، چاچی کہتی تھی۔

”رات کو پڑھ پڑھ کر تیرے بال گر رہے ہیں، چٹیا آدھی رہ گئی۔ داجی کہتے ہیں گھر میں دکھائی نہیں دیتی، ان کتابوں نے میرا بچہ چھن لیا، زربخت کو کون سا پسند ہے دیر تک دریتے کازیر و پاور بلب جلانے رکھنا، تھوڑی روشنی نے نگاہ پر اثر ڈالنا شروع کیا تھا، درخزئی کے تو کہنے ہی کیا، وہ تو چاہتا تھا بھلے اندھی ہو جائے، گھر تو نکلے گی۔ بخشہ نے دعائیں مانگنی شروع کر دیں۔“

”اللہ! میری آنکھیں ٹھیک رکھنا۔“

سہیلی کے کئی سال سے عینک لگی تھی اس نے اپنی اتار کر دی۔

”بخشتہ! یہ لگا کر دیکھ، صحیح نظر آتا ہے تم کو؟“

باریک کمائی کی چھوٹی سی عینک پتلی ناک پر جماتے ہی لمحہ بھر کے لیے تو چکر سا آیا تھا۔ جھٹکے سے آنکھیں بند ہوئیں، پھر کھولیں، بالکل صحیح تو نہیں لیکن کچھ سکون ملا تھا خاص کر دائیں آنکھ کو، ہو سکتا ہے دونوں کی دائیں آنکھ کا

نمبر ایک ہو، کچھ دیر لگا رکھنے کے بعد جب اسے لوٹائی تھی تب عد سے کی اہمیت کا پتا چلا تھا، آنکھ شدت سے چاہ رہی تھی اسے اس عد سے دیکھا جائے۔ نجستہ نے پلوشہ سے پوچھ ہی لیا۔
”یہ کتنے کی ہے؟“

”پورے ہزار کی، میرے دامی کتبہ موڑ والے عینک ساز کے پاس لے کر گئے تھے، تم بھی اسی کے پاس چلی جانا۔“

”میں دامی سے کہوں تو شاید وہ مجھے بھی لے جائیں، عینک تو لگ جائے گی مگر اور بہت کچھ چھن جائے گا۔“
سندوری ہونٹ کچلتے اس نے دل میں سوچا تھا۔

کوئی اور تدبیر نہیں تھی اس درد سے چھٹکارے کی، دو دن بعد اس نے پلوشہ سے ہی کہا تھا۔
”ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم اپنی عینک مجھے دے دو، میں تھوڑے تھوڑے کر کے پیسے دے دوں گی۔“
اس کی احمقانہ بات پر پلوشہ نے تجیر سے اسے دیکھا تھا۔
”ہر کسی کا الگ نمبر ہوتا ہے نجستہ، تم چیک کرواؤ۔“

”نہیں مجھے اس سے صحیح دکھائی دے رہا تھا، میرا یہی نمبر ہوگا، تم اور بنوالینا۔“
پلوشہ نے کچھ دیر سوچا پھر چھٹی وقت اتار کر اسے دے دی۔

”میں دامی سے کہہ دوں گی میری ٹوٹ گئی۔ یہ تم رکھ لو۔“

درد کی مجبوری نہ ہوتی وہ کبھی کسی کی چیزیں نہ لیتی، خود دار پٹھان تھی لیکن کیا کریں ظالم درد کا جو بعض اوقات خودداری پر چھا جاتا ہے، اس نے پکڑ کر عینک بیگ میں رکھ تولی اب لگانا کون سا آسان تھا۔ ایسی چیز تو تھی نہیں۔ گلے میں پہنے دوپٹے سے چھپائے رکھتی، یا بازو پر باندھ لیتی، چہرے پر ٹکانی تھی، دن میں جیسے تیسے چندھی آنکھوں سے گزارا کر لیتی تھی مگر رات کو جب سب اپنے کمروں میں ہوتے وہ عینک جما کر پڑھتی، کسی آہٹ پر بیگ میں اس عینک کی آنکھ مچولی کو تیسرا دن تھا۔ وہ اپنے پڑھنے میں مگن تھی۔ امروز لالہ کسی کام سے باہر نکلے اس کے عینک جی دیکھ کر ٹھٹک سے گئے۔

”یہ کب لگی؟“

وہ جلدی میں چھپا بھی نہ سکی، ہلتی رنگ چہرے پر چھا گیا تھا۔

”پلوشہ کی ہے۔“

”تم نے کیوں لگا رکھی ہے؟“

”وہ مجھے۔ اس سے..... صحیح نظر آتا ہے۔“

اس کے تھوک نکل نکل کر کہنے پر لمحہ بھر تو اسے دیکھتے رہے، اپنی گرم چادر صحیح طرح سے لپیٹی ایک کرسی کھینچ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

”اگر اتنا مسئلہ تھا تو کیا بتانا نہیں چاہیے تھا، اس طرح کسی دوسرے کی عینک لگا کر مزید خراب ہو گئی تو؟“

”جسے بتاتی اس نے ایک ہی بات کہنی تھی۔“ اس کے لہجے میں یک لخت نمی گھل گئی تھی۔ ”پڑھنے سے ہوئی

ہیں، دفع کرو پڑھائی کو۔“

”غلط بھی نہیں ہے یہ۔ اتنا پڑھ کر کیا کرو گی بخشتہ۔ ہم پہاڑی لوگ ہیں ہمیں پہاڑوں میں رہنا ہے۔“

”ہاں۔ لیکن ہم پہاڑ تو نہیں ہیں۔ انسان ہیں، ہمیں پہاڑوں میں ہی راستے بنانے ہیں۔“

اس کے ٹھوس انداز پر وہ کچھ دیر اس کا چہرہ ٹٹولتے رہے، اس گھرانے کی کسی لڑکی نے کبھی ایسا سوچا بھی نہ

ہوگا جو وہ کہہ جاتی۔

”مجھے سمجھ نہیں لگتی بخشتہ، تم میں پڑھائی کا اتنا جنون کس نے بھر دیا۔“

”لیکن مجھے سمجھ لگتی ہے لالہ۔“

توقف کے دوران ہونٹوں کو کچلتی بہت درد سے بولی تھی۔

”میرے باپ کی خون میں لت پت میت نے، میری ماں کے ناقص علاج سے آنے والے لنگ نے اور

میری بہن کے روزاٹھنے والے درد نے۔“



صبح چہرے کی سبز آنکھیں لال پانی میں تیر رہی تھیں، جس میں جمال خان کا خون میں لتھڑا جسم کراہ رہا تھا، پہاڑی لوگوں کی خاندانی دشمنی کی داستان ایک معمول کی بات ہے۔ وہ بھی اسی معمول کا شکار ہوا تھا۔ پہلے دادا

اس خاندانی دشمنی کی بھیٹ چڑھا پھر جمال خان حالانکہ مرنجا مرنج انسان تھا۔ جس کا معاملہ پھر کسی وقت پراٹھا رکھتے ہیں۔ کیسے صلح ہوئی کتنے لوگ اس کی بھیٹ چڑھے کتنا سرمایہ لگا، کون کون سی زمین کبی، لیکن فی الوقت جمال خان کی جان لیوں پر تھی ٹانگ پر اور کمر کے نیچے چار گولیاں لگی تھیں، ٹانگ والی تو گوشت کو پھاڑ کر خود ہی نکل گئی۔ مرہم پٹی قرمبی ڈپسری میں ہو گئی لیکن کمر والی گولی ہڈی میں ایک گئی تھی جسے نکالنے کے لیے باقاعدہ آپریشن کی ضرورت تھی۔ ڈپسری میں نہ تو آپریشن تھیڑ تھا نہ ہی کوئی سرجن۔

یہ ایک کے قریب ہی کا مرہ نواحی علاقہ تھا، گاؤں اور شہر کو ملاتا کتبہ موڑ اب اتنی دور بھی نہیں تھا یہی کوئی تیس سے چالیس منٹ کی ڈرائیو پر، وہاں ڈاکٹر بھی تھے ہسپتال بھی، کچھ وقت ڈپسری میں برباد ہو گیا تھا، کچھ تیس چالیس منٹ کا فاصلہ طے کرنے میں، اس سے پہلے کہ جمال خان کے قدم ہسپتال تک پہنچتے، اس کے پیروں سے روح نے قدم باہر نکال لیے تھے۔

بخشتہ کی عمر اتنی نہیں تھی کچھ سمجھ سکے، لیکن لوگوں کے بین نے سمجھا بہت آسان کر دیا تھا۔ پلو شہ کی ماں بار بار کہہ رہی تھی۔

”خانہ خرابہ، ڈپسری والا گولی نکال دیتا، تو اتنا خون ضائع نہ ہوتا۔“

”مڑے (ارے) بتایا تو ہے، ڈاکٹر یہاں نہیں ہوتا۔“

”جو تھا پاگل کا باچہ (بچہ) وہ خود نکال دیتا، ڈاکٹر ضروری ہے؟“

”اے بہن، گولی بڑا ڈاکٹر نکالتا ہے ڈپسری نہیں۔“

”اوہ تو گولی ڈاکٹر نکالتا ہے۔“ بخشتہ کے سہمے ذہن نے ایک بات سیکھی ہی تھی کہ چاچی نے ایک سفید چادر لاکر بہت دیر سے سکتے میں بیٹھی خانی بیگم کے اوپر ڈال دی تھی پھر جو خانی بیگم کا سکتہ ٹوٹا تھا، اس کی چیخیں آج بھی بخشتہ کے کانوں میں گرم سلاخ کی طرح گھس رہی تھیں، غم پلکوں کے سائے میں ماضی ابھر کر معدوم ہوا، لرزتی پلکیں اٹھا کر اس نے امروز خان کو دیکھا تھا وہ متاسفانہ بھنویں سمیٹے مسلسل اسے دیکھ رہے تھے۔

”لالہ! میرا باپ گولی لگنے سے نہیں مرا تھا، گولی نہ نکلنے کی وجہ سے مرا تھا۔ اگر ڈاکٹر ہوتا، شاید میرا باپ بھی ہوتا۔“ سبز جھیل سے پانی گلابی رخساروں پر چھلکا۔ ”سب کچھ ہے میرے پاس، محبت، شفقت، خیال، پیار لیکن

میرے داعی نہیں ہیں۔“ ایک منہی سکاری ن سندوری ہونٹوں پر دم توڑا، جڑے نم ہو کر بھاری ہونے لگے۔
 بھلے باپ سخت گیر ہو کر اس کا ہونا ہی بیٹیوں کے لیے آہنی چھت جیسا ہے اور خستہ کو اپنی چھت تنکوں کی لگتی تھی۔
 ”اور لالہ مرا تو میرا باپ تھا، سفید کفن میری ماں پر کیوں لپیٹا تھا، میری ماں کی وہ چٹخیں، میرے باپ کے
 خون کے قطرے میرے اندر جنون بھر رہے ہیں، مجھے ڈپسری میں ڈاکٹر بن کر بیٹھنا ہے۔ کسی اور کی ماں سفید
 کفن نہ لپیٹے بہت درد ہوتا ہے بچوں کو ماں کی چیخوں سے، باپ کی موت سے۔“
 اس کے لہجے کی نمی سے امروز خان کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔ دل گرفتگی سے اٹھتے اٹھتے اس کے سر پر ہاتھ
 رکھا۔

”خستہ بچہ یہ سب تقدیر میں لکھا تھا، ہونا ہی تھا۔“

”تقدیر کون لکھتا ہے لالہ؟“

وہ یک لخت ان کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اللہ لکھتا ہے ناں تقدیر، تو پھر اس نے جنت دوزخ کے راستے کیوں بتائے ہیں۔ تقدیر میں تو لکھا گیا ہوگا
 فلاں برا ہے، وہ دوزخ میں جائے گا، جس کو اچھا لکھا اس نے نیکی کرنی ہی کرنی ہے۔ پھر جنت، دوزخ کے
 حصول و بچاؤ کی محنت کیوں۔“

امروز خان کی تاسفانہ نگاہیں اس کے چہرے پر جمی جا رہی تھیں۔

”نہیں لالہ۔ تقدیر میں بہت سا حصہ تدبیر کا بھی ہے اور میں صرف تدبیر کی کوشش کر رہی ہوں۔ تقدیر کو رنگ
 اللہ نے چڑھانا ہے۔“



مشکلات ضرور تھیں لیکن اس کی کوشش رائیگاں نہیں جا رہی تھی، امتحان نزدیک آرہے تھے، محنت بڑھتی
 جا رہی تھی، امروز خان پہلے ہی اسے کتبہ موڑ کے ڈاکٹر سے عینک لگوا لائے تھے، پلو شہ کی واپس کر دی تھی، عینک کا
 بھی عجیب ہی قصہ تھا حد درجہ احتیاط کے باوجود ٹوٹی ہوئی ملتی تھی، خانی بیگم الگ ڈانٹتیں، چاچی الگ لا پرواہی کے
 طعنے دیتی، ٹوٹتی بھی ایسے جیسے غصے میں پکڑ کر دوہری کی گئی ہو، یہ آج تک پتا نہ چل سکا عینک پر غصہ کون نکالتا ہے،

جب کہیں رکھ کر تھوڑی دیر کے لیے اٹھی، ٹوٹی ہوئی ملی، جختہ نے آخر اسے ڈوری باندھ لی سوتے ہوئے گریبان میں ڈال لیتی، عینک محفوظ ہو گئی، درختی کا غصہ بڑھنے لگا۔

انٹر کے امتحانات کا شیڈول جاری کر دیا گیا تھا، بچیوں کو کالج سے فارغ کرتے ہوئے استانیوں نے پارٹی دی تھی۔ سب بچیاں گئی تھیں سوائے جختہ کے اسے۔ امتحانوں کی تیاری کرنا تھی بہت اچھی تیاری اور تیاری اس کی اچھی ہی تھی۔ امتحان شروع ہوئے اسے اسی بات کی خوشی تھی مرکز قریبی بنا اور وقت بھی صبح کا، پیپر دے کر بہت سا ٹائم مل جاتا، جس طرح سے وہ پیپر زدے کر آرہی تھی اسے یقین تھا سال دوم کا نتیجہ سال اول سے بھی بہترین ہوگا۔ بات ایف ایس سی پر ہی تھوڑا ختم ہوتی ہے، UHS (یونیورسٹی آف ہیلتھ اینڈ سائنسز) نے میڈیکل کے داخلے میں طلبہ کے قد سے بھی اونچی رکاوٹ انٹری ٹیسٹ کی لگا رکھی ہے، پڑھے لکھے خاندان، یا شہروں میں رہنے والے پھر اس بات کو کسی حد تک سمجھتے ہیں کہ انٹری ٹیسٹ کی تیاری کے لیے بھی کسی ادارے میں جانا پڑتا ہے، لیکن جن علاقوں میں میڈیکل کی بنیادیں ہی نہ پتا ہوں وہ اس بات کو کیا سمجھیں۔

”مڑے (ارے) تم تو کہہ رہی تھیں، بارہویں کی کتابوں سے پرچہ آئے گا، وہ پڑھ تو لیں اب کیسی تیاری۔“

خانی بیگم حیران تھیں، چاچی گھور رہی تھیں۔ جختہ ان معصوم عورتوں کو اپنا فرسودہ نظام تعلیم کیا سمجھاتی، ایف ایس سی کے اندر استاد جو حصہ یہ کہہ کر چھڑوا دیتے ہیں، ”بچو! یہ چھپر چھوڑ دو، اس میں سے کبھی پیپر نہیں بنتا، پچھلے پانچ، چھ سال کے پیپر زدیکھ لو، یہ سوال نہیں ملیں گے، باقی کی تیاری کرو۔“ اور وہ ہی ایف ایس سی کا مشکل ترین حصہ میڈیکل کالج کے انٹری ٹیسٹ کا نچوڑ ہے، دو سالوں میں استاد وہ مشکل حصہ پڑھانے سے گھبراتے ہیں۔ UHS یہ چاہتی ہے بچے نوے دن کی تیاری میں وہ انگلیوں کی پوروں پر کسی روبوٹ کی طرح یاد کر لیں، سلوٹ ہے اس دور کے بچوں پر وہ پھر بھی کر لیتے ہیں۔ کر تو جختہ بھی لے گی مگر اسے اس ادارے تک جانے کا رستہ تو ملے۔

ایم۔ کیٹ (میڈیکل کالج انٹری ٹیسٹ) کی کلاسز تمام کوچنگ سنٹرز میں پیپر زدے اگلے دن ہی شروع ہو چکی تھیں اور میڈیکل کے تمنائی بچے دھڑا دھڑا اس میں داخلہ لے کر اکیڈمی مافیا کی ہانڈی بھر رہے تھے، ایک تو

کامرہ انک کا نواحی علاقہ، پھر گھر والوں کو قائل کرنے میں اسے پندرہ دن لگ گئے تھے۔ امروز خان اس کے شوق کے آگے ہار گئے تھے انہوں نے ہی داجی کو قائل کیا تھا۔

”ایک میڈیکل کالج برائے خواتین بھی ہے فاطمہ جناح میڈیکل کالج۔ ہو سکتا ہے اس میں نام آجائے، آج کل سب کی لڑکیاں پڑھ رہی ہیں اور اس کا شوق ہے، ہمیں دیوار نہیں بننا چاہیے داجی۔“

اگر شوق کو راستہ گھر والے نہ دیں تو وہ جنون بن جاتا ہے، جنون پستی کا دوسرا نام ہے، داجی کو قائل کر کے اسے پستی سے امروز لالہ نے بچالیا تھا، انہوں نے ہی ایک وین کا انتظام کیا جو اسے انک شہر کی اکیڈمی تک لاتی لے جاتی، دن تو بہت گرم تھے مگر پہاڑ ان کی گرمی کو کسی حد تک جذب کر لیتے تھے اس نے دن رات محنت کی تھی۔ ساری تیاری مکمل تھی، رونمبر دے کر دن کا اعلان ہو چکا تھا۔



عموماً اکیڈمی ”بیسٹ آف لک“ کارڈ دیتے ہوئے آخری دن کی چھٹی دے دیتی ہے، تاکہ بچے رلیکس ہو کر اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دیں لیں۔ اس نے ساری رات پڑھا تھا، فجر پڑھ کر کچھ دیر کو سوئی، سورج اونچا ہوتے ہی اٹھ گئی۔ آج اکیڈمی نہیں جانا تھا کیونکہ بیسٹ آف لک آزمائش تھی۔ سارا دن اپنا تھا، آٹھ کتابیں، دو سال کی محنت ایک طرف اس ایک دن کی محنت ایک طرف وہ ناشتہ کرتے ہی کتابیں لے کر درپچے میں بیٹھ گئی، داجی اور امروز لالہ اپنے کام سے باہر تھے، کچھ ہی دیر میں صحن کے بیچ و بیچ دھاڑ دھاڑ کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اس نے دو تین بار ناگواری سے دیکھا تھا۔ درخزئی گھر کا مین دروازہ اتارے جانے اس میں کیا ٹھوک رہا تھا چاچی سر پر دوپٹہ باندھتی ہوئی اسے پوچھنے آئی تھیں۔

”کیا ٹھوکا ٹھوک لگا رکھی ہے، ہمارا سر پھٹنے کو ہو گیا۔“

”دروازہ خراب ہو رہا ہے، وہ ٹھیک کرنے لگا ہوں۔“ کہہ کر اس نے پوری قوت سے پکی لکڑی پر ہتھوڑے برسائے شروع کیے، خستہ تنگ آ کر اٹھ کے آئی تھی اور بہت ملتی انداز میں بولی تھی۔

”خدا کے واسطے، کل ٹھیک کر لینا۔“

”اچھا تاکہ گھر میں چور گھس آئیں، دیکھا نہیں، دیمک نے سارا لکڑی کھا لیا ہے۔“

اس نے آری کے ساتھ دروازے کا ایک حصہ کاٹ الگ کیا اور پکی لکڑی کا کلڑا اٹھا کر میٹھیں اس میں گاڑنے لگا۔

”ایک دن سے کیا ہوتا ہے کہیں نہیں دیکھ کھا جاتی۔“

بخستہ کی منتوں پر اس نے اس کو استہزائیہ دیکھتے کہا تھا۔ ”دیکھ رہا ہے، دیکھ ایک دن میں واقعی نہیں کھاتی۔ ہونہہ۔“

اس نے گردن جھٹک کر پہلے سے بھی زیادہ قوت سے ہتھوڑے برسانے شروع کیے، بخستہ نے جا کر کمرے کا دروازہ بند کر کے ہتھیلیاں کانوں پر جمالی تھیں، اسے اپنی بے بسی پر بہت رونا آیا تھا اسے وہ سب لڑکیاں یاد آنے لگیں جو روز کہتی تھیں۔

”میرے حاجی نے آج کل گھر میں مہمانوں کی آمد پر پابندی لگا رکھی ہے۔ میں ڈسٹرب نہ ہوں ناں۔“ کوئی کہتی۔ ”مورے (ماں) میرا بہت خیال کرتی ہے، با دام اخروٹ، دودھ کے ساتھ دیتی ہے۔ پڑھ پڑھ کے سر دکھنے لگتا ہے ناں۔“

اور بخستہ کے سر پر ہتھوڑے برس رہے تھے، آہنی ہتھوڑے سے میٹھیں پھٹنے میں گھسنے کی آواز سارے گھر میں گونج پیدا کر رہی تھی۔ اسی گونج میں اسے تیاری مکمل کرنا تھی اور وہ کربھی رہی تھی۔ سورج کی آخری کرنیں پتھروں میں دفن ہونے کو تھیں۔ اسی ٹھک ٹھاہ میں اس کی تقریباً ساری دہرائی ہو چکی تھی۔ صرف فزکس کے نو میریکل (Numericals) جو محنت طلب بھی تھے اور توجہ بھی چاہتے تھے وہ اس نے رات کے لیے چھوڑ دیے تھے، ظاہر ہے جب تک دروازہ ٹھیک ہو جانا تھا اور شور مچتا جاتا آرام سے ہو جانے تھے، ایک تو اس بات کی سمجھ نہیں آتی میڈیکل سے فزکس کا کیا تعلق ہے، کیمسٹری تو پھر سمجھ آتی ہے ایم بی بی ایس میں بھلے کم مگر سفر ساتھ رہتا ہی ہے، لیکن فزکس۔ اور پھر سلیپس میں اس کے نو میریکل؟ ظاہر ہے، ہمارا تعلیمی مافیا جو سرکار کے اونچے عہدوں پر فائز ہے، اس نے اپنے پرائیویٹ میڈیکل کالجز بھی تو چلانے ہیں، گورنمنٹ کالجز کے آگے بیریر لگے تو اربوں کی آمدن سے ان کے بچوں کی روزی روٹی چلے، آہ ہمارا پیارا سسٹم!



دروازہ ٹھیک ہو کر لگ چکا تھا، درود یوار سے گونج ختم ہوئی ہی تھی کہ سارے گھر میں یک لخت اندھیرا چھا گیا۔ اس نے دروازے سے باہر درخزئی کو جاتے دیکھا تھا اور بس اندھیرا، گھر کی ساری بتیاں چیک کر لی تھیں، کچھ سمجھ نہیں آئی تھی لائٹ کو ہوا کیا، داجی گھر آچکے تھے۔ امروز خان نے سوچ چیک کیے، یہی سمجھ آئی تھی شاید وارنگ اڑ گئی، داجی نے تو کہا بھی۔

”تم گھر میں تھا کسی کو دکھا دیتے۔“

”داجی! جو ہوا ہے ابھی ہوا ہے، ہمیں کیا پتا، وارنگ خراب ہو یا بجلی پیچھے سے گیا ہے۔“

اللہ تو بہر حال جانتا ہی تھا خجستہ کو بھی پورا یقین تھا درخزئی کا کچھ ہاتھ ضرور ہے اور واقعی اس نے میٹر سے پلائی تار چپکے سے کاٹ دی تھی۔ گھر میں ایک دو بیڑی تھی۔ کوئی لے کر کمرے میں جا رہا تھا، کوئی باتھ روم یا کچن میں، خجستہ نے امروز لالہ کے موبائل کی ٹارچ آن کی۔ موبائل منہ میں دبائے نو میر کلوجل کیے تھے۔ اس کی آنکھوں میں اٹکرا تاپانی اور دل کی دھڑکن واضح کہہ رہی تھی۔

”درخزئی! تمہارے اندھیرا کرنے سے کچھ نہیں ہونے والا، بس میرا اللہ اندھیرا نہ کرے۔“



تھکن سے چور رات ختم ہوئی۔ سنہرا دن طلوع ہو چکا تھا، انٹری ٹیسٹ کے مرکزی سنٹر کا بھرپور ٹارچراپنے نازک کندھوں پر اٹھاتے بچے گروہ درگروہ تھے، تیار ایمونولینسز، ٹیسٹیر میڈیکل کمپ، اور ماں باپ کی تسکیناں۔ چونٹیس سویٹوں کے لیے اس ملک کے ذہین ترین ساٹھ ہزار بچہ نقدیر اور تدبیر کے رنگ دیکھنے نکلا تھا۔ ہر طبقے کا بچہ تھا۔ خجستہ نے مرکز میں قدم رکھنے سے پہلے ایک نگاہ اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھتے ایک بات سوچی تھی۔

”نہیں بدل سکتا کوئی اسے، اگر میرا رب ارادہ کر لے۔“

ہمیں وقت سے پہلے چاہیے ہوتا ہے لیکن رب کے ارادے وقت پر رنگ دکھاتے ہیں، رب کے ارادے کا رنگ چڑھنا شروع ہو گیا تھا۔

حسب روایت مشکل سے مشکل ترین پیپر مخصوص وقت میں حل کر کے وہ بہت پر امید واپس لوٹی تھی۔ شام تک میٹ پر آنسر کی (درست جواب) بھی آچکی تھی اور پچھلے سالوں کے میرٹ کے حساب سے بہت اچھا

ایگریگیٹ بنا تھا۔ کبھی دو تین سال پہلے آنسر کی آتے ہی فیصلہ ہو جاتا تھا، کون بچہ میرٹ پر سلیکٹ ہے کون رینجکٹ، لیکن اب ذہین بچوں کی بڑھتی تعداد اور محدود سیٹوں نے میرٹ میں اتنے بڑے بڑے اپ سیٹ کئے ایڈمیشن لسٹ لگنے سے پہلے کہنا ہی مشکل ہے میرٹ کہاں ٹھہرتا ہے اور میرٹ بننے کے مراحل اور لسٹ لگنے میں لگ بھگ دو ماہ کہیں نہیں گئے اور ان دو ماہ میں باقی تمام یونیورسٹیز میں فیس جمع ہو کر داخلے بند ہو چکے ہوتے ہیں۔

کیا خوب کمیونیکیشن پائی ہے ہمارے اداروں نے کہ میڈیکل لسٹ سے رینجکٹ ہو جانے والے ہزاروں ذہین بچے کہاں جائیں گے؟ کیا ان کا یہ جرم کم ہے، ذہانت کی بنیاد پر انہوں نے میڈیکل کا شعبہ چنا۔ کیوں چنا؟ یہ اب ان کی سزا ہے، اور کتنی زندہ دل قوم ہیں ہم، اپنے آنے والے بچوں کے لیے قلم اٹھانا تو کیا، قلم پکڑنا بھی چھوڑ رہے ہیں۔ خیر یہ خشک قصہ پھر کسی وقت پراٹھا رکھانی الوقت قصہ ہے۔ ایک پہاڑی نجستہ کے ڈاکٹر بننے کا، نجستہ کی تقدیر پر تدبیر کا رنگ چڑھ گیا تھا جب میڈیکل کالج کی لٹیں لگیں۔ اپنا مکمل نام، تاریخ پیدائش، شہریت، امتحانی کارکردگی کے ساتھ راولپنڈی میڈیکل کالج کی لسٹ میں جگہ گاتا دیکھ کر وہ اندھا دھند بھاگتی آئی تھی۔ خوشی سے بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا اور سبز آنکھیں نم، دلان کی جانب بڑھتے اس کے قدم داجی کی آواز پر ہنسنے لگے تھے۔

”امروز خان! تم تو کہتا تھا اس کا داخلہ لڑکیوں کے کالج میں ہو جائے گا، لیکن پنڈی کے کالج میں تو لڑکے ساتھ پڑھتے ہیں۔“

”ہاں داجی! نمبر تو اس کے بہت تھے، میرٹ اس سال اور اوپر چلا گیا۔ کیا کیا جاسکتا ہے۔“ یعنی کہ امروز لالہ اس سے پہلے میرٹ لسٹ چیک کر چکے تھے۔ ہونا تو نجستہ کو خوش چاہیے تھا لیکن صورت حال کچھ اور بن رہی تھی۔

”کیا مطلب ہے۔ کیا کرنا ہے۔“

امروز کے جواب پر درختی پورے کروفر سے تڑپ کر اٹھا تھا۔ ”اب ہم اتنا بے غیرت ہو گیا ہے، اسے لڑکوں کے ساتھ پڑھنے بھیجیں۔ بٹھاؤ گھر میں ورنہ بھاگ جائے گی وہ کسی بے حیا کے ساتھ۔“

سننے ہی جستہ کے پاؤں زمین پر ایسے چپک گئے تھے جیسے میخیں گاڑ دی گئی ہوں، اس نے ترحم بھری نگاہ سب پر ڈالی تھی، خانی بیگم سر پکڑے بیٹھی تھیں، چاچی انگلی گال میں گاڑے درخزئی کی بات پر غور کر رہی تھیں، شروع سے دبوز ر بخت کو تو بھاگ جانے کے خوف سے پسینہ آ گیا تھا، امروز لالہ، دامجی چپ تھے، کبھی کبھی ہماری جنگ میں ہمارے ماں باپ بھی ساتھ کھڑے نہیں ہوتے، حالات سے ڈر جاتے ہیں، اس کے ساتھ بھی کوئی نہیں کھڑا تھا، اسے خود کھڑے رہنا تھا۔ اپنے لیے خود لڑنا تھا۔ وہ قدم اٹھاتی ان کی جانب بڑھی، قدم اس قدر بھاری تھے اسے لگا زمین اس کے قدموں سے چپک گئی ہو اور ہر قدم پر ساری زمین اس کے ساتھ گھسٹ رہی ہو، خوشی سے لرزتا بدن خوف میں ڈھل گیا تھا مگر اس نے امید نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے اپنے قدموں میں جان پیدا کی، آواز پر قابو رکھا۔

”دامجی! میں پہاڑوں کی بیٹی ہوں۔ پستیوں سے بچنے کے لیے، اونچے اونچے راستوں پر مجھے جما کر قدم رکھنے آتے ہیں۔“

سب نے ہی چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ درخزئی تو ایسے دیکھ رہا تھا، جیسے ابھی چیر پہاڑ کرا سے پستیوں میں پھینک دے مگر وہ ملتی انداز میں دامجی کو دیکھتے کہتی رہی۔

”جو خود کھائی سے ڈرتی ہو، وہ اپنے دامجی یا لالہ کو گرنے دے گی؟“

اس کے سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا سوال بہت تھے کئے بھی وہ جواب دیتی رہی قائل کرتی رہی اور آخر جب کچھ بات بنتی نظر نہ آئی۔ آخری حربے کے طور پر کہا تھا۔

”امروز لالہ! مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دیں میں ضد چھوڑ دوں گی۔“

امروز اور سیف اللہ نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔ وہ قطعیت سے کہہ رہی تھی۔

”ہم بیٹیوں کو ڈاکٹر بننے نہیں دیتے، بہت کھلی تعلیم ہے یہ، لیکن بیوی کے علاج کے لیے لیڈی ڈاکٹر ہی کیوں ڈھونڈتے ہیں، یہاں تک کہ ڈاکٹر کی تلاش میں وہ درد سے تڑپ کر مر جائے۔“

درخزئی اس کی بات پر استہزائیہ ہنسا تھا۔ امروز نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے مگر اس کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

”زوار کا کا کی بیوی تو سب کو یاد ہوگی ایسی بھولنے والی بات ہے تو نہیں۔“

زوار خان پہاڑ کی پچھلی جانب کی گلیوں میں رہتا تھا، بہت نیک خدا ترس انسان تھا۔ اس کی بیوی زرینہ کو جانے کیا ہو گیا تھا۔ تکلیف ہاتھوں کی معمولی خارش سے شروع ہوئی تھی۔ پھر سارے بدن میں پھیل گئی، خارش کرنے پر چھوٹے چھوٹے دھبہ بن جاتے جن میں سرخ دانے بننے لگے، کوئی چھپا کی کہتا، کوئی چنبل دانے، سرخی سے زردی میں ڈھلنے لگے تھے، پہلے گھریلو علاج شروع ہوا، فرق نہ پڑنے پر اڑوس پڑوس کے ٹوٹکے، تکلیف شدت پکڑنے لگی تو بات حکیم تک جا پہنچی، زوار خان حکیم کو حالت بتا کر مرہم لے آیا جتنی دیر مرہم لگا رہتا سکون رہتا۔ جیسے جیسے کچھ وقت گزرتا خارش میں شدت پیدا ہوتی۔ یہاں تک کہ زخم رسنے لگے تھے۔ کسی نے انک لے جا کر ڈاکٹر کو دکھانے کا مشورہ دیا تھا، زوار نے کئی لوگوں سے پتا کر لیا تھا انک میں اسکن کی کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں تھی۔ مرد ڈاکٹر کو وہ اپنی بیوی کا جسم دکھائے اس سے کہیں بہتر تھا بیوی مر جائے۔ پھر ایسا ہی ہوا لیڈی ڈاکٹر تو نہ ملی البتہ وہ خالق حقیقی کو جا ملی۔

اس کے مرنے سے فرق کسی کو نہیں پڑا تھا۔ نہ زوار کو نہ زوار کے گھر کو۔ کیونکہ گھر کی ابتری دیکھ کر دو ماہ میں ہی زوار نے دوسری شادی کر لی تھی لیکن اس کی دو سالہ بیٹی کی زندگی سارے محلے نے دیکھی تھی۔ تین اوقات کے کھانے کے ساتھ مار پیٹ کسی دوائی کی طرح خوراک میں شامل ہو چکی تھی، کسی وقت کی خاموش بچی کی ضد اب پورے علاقے میں مشہور تھی۔ سب کو ترس آ جاتا تھا سوائے زوار خان کے۔ ویسے بھی مشہور ہے ماں بدل جائے باپ پہلے بدل جاتا ہے۔

خجستہ نے جس انداز میں کہا تھا امروز کی آنکھوں کے سامنے زوار خان کی روتی ہوئی بیٹی آکھڑی ہوئی تھی۔ حاجی چپ تھے۔ درخزئی کا چپ رہنا ہمیشہ ہی مشکل رہا تھا، استہزائیہ رخسار پھیلاتے بولا تھا۔

”بیماری اور شفا اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، اس میں زوار کا کا، کا کیا قصور؟“

”شفا اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، شفا کے لیے بھاگ دوڑ بھی اللہ ہی کا حکم ہے۔ اگر علاج کا حکم نہ ہوتا تو علاج کے اللہ طریقے ہی نہ بتاتا۔ کیوں امروز لالہ؟“

اس نے درخزئی کو نظر انداز کرتے ہوئے امروز کی جانب دیکھا تھا۔

”علاج کا حکم ہے نا۔ اور کیا ہم علاج کے لیے لیڈی ڈاکٹر نہیں ڈھونڈتے۔ بے شک تلاش میں بیماری کتنی بڑھ جائے۔“

امروز کی نگاہ میں پشیمانی لہرائی تھی۔ زربخت کی گردے کی تکلیف بھی یونہی بڑھتی جا رہی تھی۔ علاقے کی گائنا کالوجسٹ کو دکھایا۔ اس کا خیال تھا الٹرا ساؤنڈ ہوتا کہ بیماری واضح ہو اور الٹرا ساؤنڈ لیڈی اسپیشلسٹ نزدیک علاقے میں کہیں بھی نہیں تھی۔ یہی طے تھا کبھی وقت نکال کر راولپنڈی جائیں گے تو یہ کام بھی ہو جائے گا۔ نجستہ کی باتوں پر امروز کی نگاہ زربخت پر گئی، کچھ دیر ہی بیٹھے رہنے سے اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے اچھے خاصے آثار تھے، اس کی گود میں لیٹی چھوٹی سی پری پر امروز کی نگاہیں گڑی رہ گئی تھیں اور ایک منٹ لگا تھا انہیں نجستہ کی حمایت کرنے میں۔

”تم اپنی تیاری شروع کرو ہم تمہیں چھوڑ کر آئے گا۔“
 حاجی امروز کا چہرہ دیکھتے رہ گئے مگر بولے کچھ نہیں۔ درخزئی نے بہت شور مچایا۔ یہاں تک کہ منگنی توڑ دے گا۔ امروز نے اسے ایک بات کہی تھی۔
 ”خواہ مخواہ کی ضد پر احمقانہ فیصلے نہیں کئے جاتے۔“



گھر کا فرد ہاتھ تھام کر چلائے تو خوشی دیدنی ہوتی ہے، نجستہ بھی بے حد خوش تھی جب امروز لالہ اور زربخت اسے کالج چھوڑنے آئے تھے۔ امروز نے دو دن پہلے آکر ہوٹل اور کالج کے تمام واجبات جمع کروا دیئے تھے۔ اصل ڈاکومنٹس کیونکہ اسٹوڈنٹ نے خود جمع کروانے ہوتے ہیں اسی لیے یہی کام رہ گیا تھا۔ وہ تیزی سے ایڈمن آفس کی جانب بڑھے ہی تھے سامنے سے سینئرز کا ایک بیچ قریب آیا۔
 "are you first year.....?" (آپ فرسٹ ایئر ہیں)

"yes"

اول تو فرسٹ ایئر کی تصدیق قطعاً ضروری نہیں اپنی ہوتی سے دور سے دور ہی پہچانی جاتی ہے لیکن نجستہ نے خاصے اعتماد سے گردن ہلائی تھی۔

”ویکلم ویکلم۔“

ایک لڑکا جوش سے ہاتھ ملانے کے انداز میں آگے بڑھا، خجستہ جھینپ کر دو قدم پیچھے ہو گئی۔ امروز خان کی آنکھوں میں یک دم آجانے والی سرخی اس کی ساتھی لڑکی نے پل میں محسوس کی اور اپنا ہاتھ بڑھاتے مسکرائی تھی۔

”اچھو لی ہم سب فرسٹ ایئر کا ہی ویٹ کر رہے تھے، ہم آپ کے سینئرز ہیں، ہماری ڈیوٹی ہے آپ کو گائیڈ کرنا، آپ کی کلاس تک لے جانا۔“

خجستہ نے اپنے دونوں ہونٹ اندر کی جانب بھینچ رکھے تھے، وہ لڑکی اب امروز خان سے مخاطب تھی۔

”آپ ان کے.....؟“

”بھائی۔“

”بس پھر بھائی اب آپ بے فکر ہو کر جاسکتے ہیں۔ یہ اصل جگہ پہنچ چکی ہیں، یہاں سے فارغ ہو کر ہم سب ہوٹل چلے جائیں گے، یہ ہمارے ساتھ ہوں گی۔“

امروز کا وہاں سے ہٹنے کو ایک پل بھی دل نہیں کیا تھا لیکن جانا تو تھا ہی۔ جاتے جاتے کئی بار کی کہی نصیحتیں پھر سے دہرائی تھیں۔

”لالہ! میرے قدم جب بھی ڈمگائے میں واپس آ جاؤں گی۔“

بھلے وہ اندر سے جتنی بھی ڈری تھی لیکن بہت آرام سے امروز کی تسلی کی تھی۔

”شباباش۔“

اس کے سر پر پیار بھری تھپکی دے کر واپسی کے لیے مڑے تھے، خجستہ گردن پھیرے انہیں جاتا دیکھ رہی تھی جب اسی لڑکے نے اس کے ہاتھ میں پکڑی فائل اچک لی۔ وہ ساری گھومی تھی۔

”یہ..... میری ہے۔“ خجستہ کی دبی سی آواز نکلی تھی۔

”اور بچنل ڈاکو منٹس ہوں گے؟“ اس نے فائل کھولتے تبصرہ کیا تو خجستہ ہاں میں سر ہلاتی رہ گئی۔ جب وہ اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

”نو پرابلم، اسے میں سب میٹ کروا تا ہوں، آپ جائیں ان کے ساتھ، آپ کی کلاس ہے۔“

لیکن یہ تو اسٹوڈنٹ نے جمع کروانے ہیں۔ میں نے سنا ہے سائن وغیرہ۔“

اس کے ڈرے لہجے پر سارے گروپ نے قہقہہ لگایا، وہ خفت سے سرخ پڑ گئی، وہی لڑکا دوبارہ بولا تھا۔

”ہم کون سا کھوتے ہیں، ہم بھی اسٹوڈنٹ ہی ہیں بی بی، سائن بھی کرنے آتے ہیں۔ بھلے آپ کا نام مشکل سہی مگر لکھ لیں گے۔ ہماری ایڈمن سے جان پہچان ہے، ذرا جلدی کام ہو جائے گا آپ کا۔“

گروپ کی کچھ لڑکیاں ہادی کو دانت کھوستے دبے دبے انداز میں اشارے کر رہی تھیں۔

”دو اس کی فائل۔“ ہادی نے واضح کندھے اچکائے اور گروپ کو ڈپٹ کر بولا۔

”سینئرز کیا مسئلہ ہے آپ کے ساتھ۔ انہیں ڈی ایچ لے جاؤ۔ دیر ہو رہی ہے ان کی کلاس مس نہ ہو

جائے۔“

”بہت برے ہو تم ہادی۔“

”اسٹوڈنٹ!“

”ذلیل!“

جس کے منہ میں جو آیا اس نے کہا اور خجستہ کو ساتھ لے کر چل پڑے۔

ہاتھوں کو مسلتے ان کے پیچھے چلتے خجستہ کو اپنی فائل کی فکر تھی۔

”میرے اللہ میں یہاں آ تو گئی، پتا نہیں یہاں کے لوگ کیا کریں گے۔ زندگی میں ایک درخزئی کم تھا۔“

پاؤں کے نیچے گھاس روندتا بے فکر چلتا سینئرز کا گروپ اسے مزید ہراساں کر رہا تھا۔

”ڈاکٹر بننا آسان تھوڑی ہے، بڑے مرحلے ہیں یہاں، کم از کم چھری چاقو سے بالکل نہیں ڈرنا۔ خیر ہم ہیں

ناں آپ کی مدد کو۔“

اور خجستہ کو لگا تھا واقعی اس کی مدد ہونے جا رہی ہے۔ آنکھیں تو تب کھلی تھیں جب وہ ڈی ایچ ہال پہنچ چکی

تھی۔ ایک عجیب سی بساند میں رچا کرہ جس کی چار دیواری پر شیشے کی کیبن نما الماریاں بنی تھیں اور سب میں

انسانی اعضاء کی ہڈیاں مختلف رنگوں کے ساتھ رگوں اور خلیوں کے ڈائیکرام سے سجا کر ایسے رکھی تھیں جیسے قیمتی

ڈیکوریشن ہوں، کچھ پلاسٹر آف پیرس کی لگیں، کچھ اصل، بنا آنکھوں کی کھوپڑی اور ایک جار میں تیرتی آنکھیں

دیکھ کر تھوک خود بخود حلق میں اٹک کر گرا تھا لیکن وہاں پہلے بھی فرسٹ ایئر کے لڑکے لڑکیاں کھڑے تھے جنہیں سینئرز کا ایک اور گروپ عجیب و غریب لیکچر دے رہا تھا، بچے کبھی شرم سے سرخ پڑ جاتے کبھی خوف سے پیلے۔ جختہ بھی ان میں آکر شامل ہو چکی تھی۔ وہ جہاں کھڑی تھی اس کے آگے ایک بڑا سا اسٹیل کا بیٹی نما لمبا چوڑا ڈبہ سا رکھا تھا اور ایسے سے اس ہال میں کئی ڈبے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ یہی تاثر آتا ”میڈیکل کالج کے ڈیسک لکڑی کے بجائے اسٹیل کے ہیں، کمال ہے“

تب ہی اس نے اس پر اپنی کہنیاں ٹیکیں اور غور سے سینئرز کی باتیں سننے لگی۔ جن میں اہم بات یہی تھی جو وہ بار بار دہرا رہے تھے۔

”سینئرز کا بہت احترام ہوتا ہے میڈیکل سائنس میں، آپ کو لیکچر ٹیچر ز دیں گے مگر سمجھائیں گے ہم، ہماری مدد کے بغیر آپ پاس نہیں ہو سکتے، اس لیے ہم سے بنا کر رکھیے گا۔“

یہاں تک تو بات بالکل ٹھیک تھی۔ میڈیکل میں سینئرز کے بغیر جو نیر واقعی صفر ہے لیکن اس صفر کو اپنی حیثیت بڑھانے کے لیے سینئرز کی کیسی کیسی باتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں یہ بیچارے جو نیر ہی جانتے ہیں۔ ہال میں ہادی کے داخل ہوتے ہی جختہ کی نگاہ اس پر گئی تھی۔ وہ وہاں سے ہی پکاری تھی۔

”بھائی میری فائل؟“

ہادی نے اس کے قریب ہوتے انجان بننے کی اداکاری کی تھی۔

”کون سی فائل؟“

ایک دم تو جختہ کے کان سننا گئے۔

”وہی میرے اور بیجنل ڈاکومنٹس۔ وہاں گراؤنڈ میں آپ نے لی تھی۔“

وہ ابھی یاد کروا رہی تھی ہادی کی نگاہ فارملن باکس پر گئی جس پر وہ کہنیاں ٹیکے کھڑی تھی، اس نے اپنی شرارت کو منہ میں کنٹرول کرتے بہت سنجیدگی سے کہا تھا۔

”اوہ اچھا وہ فائل۔ وہ تو اس میں آگئی۔“

اس نے بھنویں فارملن باکس کی جانب نچائی تھیں۔

”اس میں۔ کیسے۔؟“ وہ بے یقین تھی۔

”آپ کو نہیں پتا۔ ایم بی بی ایس میں سب سے پہلے میجک ہی سکھایا جاتا ہے، سیمپل ہے یار۔“
وہ ایک کرسی کھنچ کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

”درد آپ کے سر میں ہوتا ہے، ڈاکٹر عینک آنکھوں پر لگا دیتا ہے، ٹھیک ہو جاتا ہے نادر۔ خراب پیٹ ہوتا ہے، ڈرپ آپ کے ہاتھ پر لگتی ہے۔ بتاؤ غلط کہہ رہا ہوں، خون کا پریشر دل میں بڑھتا ہے اور بی پی آپ کی بازو سے چیک کیا جاتا ہے، کبھی دیکھا بی پی آپریٹر آپ کے دل پر لپیٹا ہو۔ ہوتے ہیں نہ ڈاکٹر پاگل۔“
سینئر زہنی رو کے فرسٹ ایئر کو دیکھ رہی تھی اور فرسٹ ایئر پتھر جیسے سراہاں میں ہلاتی رہی۔ ہادی جیسے اسٹائل سے بیٹھا تھا ویسے ہی اٹھا اور ٹھوس انداز میں جختہ سے بولا۔

”اسی جادو کے ذریعے آپ کی فائل اس میں آگئی ہے۔ اب ایسا ہے کہدیاں ہٹا کر ڈراڈھکن اٹھائیں اور فائل نکال لیں۔“

اس نے حمایتی نگاہ سب پر اٹھائی تھی اور سینئر کی تائیدی نگاہیں اسے ڈھکن اٹھانے کا کہہ رہی تھیں۔ ڈھکن اس اکیلی سے تو اٹھنے سے رہا تھا جس طرح سے جماتھا۔ فرسٹ ایئر کے دو تین بچے اس کی مدد کو بڑھے تھے اور پھر کیا تھا پورا ڈائیسیکشن ہال فرسٹ ایئر کی دبی دبی چیخوں سے سہم رہا تھا۔

بکس میں فارملن (محفوظ کرنے والا کیمیکل) میں بھیگی ایک برہنہ ڈیڈ باڈی رکھی تھی جس کا سارا جسم کسی سیاہ لکڑی کی مانند اکڑا ہوا خوف ناک لگتا تھا۔ ڈائیسیکشن ہال کا مطلب اب پوری طرح واضح ہوا تھا، یعنی مردوں پر تجربہ گاہ، یہ بھی شکر ہے میڈیکل میں پہلے دو سال مردوں پر ہی تجربے کرواتے ہیں ورنہ آدمی آبادی تو ڈاکٹر بنانے بنانے میں ہی ٹھکانے لگا دیتے یہ میڈیکل والے، اور تیسرے سال بھی بچا رہے مریض کو کیا پتا اس پر کون سی پڑھائی پڑھی جا رہی ہے وہ اور گھر والے تو دل میں خوش ہو رہے ہوتے ہیں، ہمیں ڈاکٹر ز کافل بیج چیک کرنے آیا ہے۔ یہ تو صرف ڈاکٹر ز اور اللہ جانتا ہے کہ وہ اپنے سینئر ڈاکٹر کے ساتھ اس پر کون سا نیا تجربہ سیکھنے آئے ہیں، خیر۔

ہادی فل موڈ میں ان کے قریب آیا۔

”کیا ہوا۔“ اس نے تاسفانہ چہ چہ کیا تھا۔

”فائل کی ڈیڈ ہاڈی بن گئی۔ ادہ۔“ وہ سیاہ کمانیوں کی عینک اتار کر کچھ سوچنے کی اداکاری کرنے لگا تھا۔

”کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے اس نے اپنے نیچے چھپالی ہو، بڑا شرارتی ہو گیا ہے، خوبصورت لڑکیوں سے پنگے لینے لگا ہے۔ چلو اس کے نیچے دیکھ لو۔“ عینک جماتے ہوئے یقین دہانی کروائی۔
”نہیں۔“

بخستہ کے ساتھ باقی فرسٹ ایئر بھی لرز کر پیچھے ہوئی تھی، شرم بھی تھی خوف بھی۔

”لوجی آئے ہیں ڈاکٹر بننے اور ڈرگئے ڈیڈ ہاڈی سے۔ مائی ڈیئر فرسٹ ایئر، یہ ڈیڈ ہاڈی آپ کو کچھ نہیں کہے گی، وہ ڈیڈ ہے، جو کہیں گے آپ ہی کہیں گے اس بیچارے کو، بڑا ہی معصوم ہے، ہر ظلم سہہ لیتا ہے۔“ ہادی نے بولتے ہوئے پاکٹ سے سرجیکل گلوں اور ماسک نکال کر پہنا اور فارملن بکس میں ہاتھ ڈال کر ڈیڈ ہاڈی کا پتھر جیسا اکڑا فارملن کیمیکل سے چھپا ہاتھ کچھ اوپر اٹھا کر فرسٹ ایئر کے بچوں سے مخاطب ہوا تھا۔

”چلو بھئی، باری باری آگے بڑھو اس سے سلام کرو۔ پرسوں سے آپ کی باقاعدہ ڈائی سیکشن شروع ہو جانی ہے، اس بیچارے کی چیر پھاڑ سے پہلے اپنے تعلقات بحال کرو۔ بلیومی یہ کسی کو اندر نہیں کھنچے گا، بہت شریف بندہ ہے۔ شاہاش آگے آؤ۔“

سب لڑکیاں ایک دوسرے کے بازو تھامے چپکی قدم قدم پیچھے ہوئیں، لڑکے الگ ہونق بنے کھڑے تھے، ہادی نے حیرت سے آنکھیں پھیلانیں۔

”ہائیں۔ کیا ہوا۔ چلو بخستہ آپ آگے آؤ۔ سلام کرو پھر یہ فائل دے دے گا۔“

”نہیں۔“ وہ مزید پیچھے ہو گئی۔

”بھئی کیا نہیں نہیں لگا رکھی ہے۔ فائل نہیں چاہیے۔“

وہ انکار میں سر ہلاتی رہی۔

”سوچ لو۔ پھر کالج والے نکال دیں گے۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو اس کی طرح تیر گئے تھے، کس مشکل سے تو یہاں تک آئی تھی گھر میں صرف درختی

اس کی بے بسی کو محظوظ کرتا تھا اور یہاں بہت سے لڑکے لڑکیاں اس کی بے بسی پر جس طرح مسکرا رہے تھے سب اسے درخزئی ہی لگے تھے سیکنڈ ایئر کی فارہ نے ہانک لگائی۔

”سیکنڈ ایئر۔ سارے فارملن بکسر کھول کر، لائنس آف کریں اور جلدی باہر نکل کر ڈورز لاکڈ کرنے ہیں۔ آج فرسٹ ایئر کو ڈیڈ باڈیز ویکلم کریں گی۔“

پھر کیا تھا ڈائی سیکشن ہال میں چیخوں کا ایسا طوفان ابھرا جیسے چھت گر جائے۔ ایک دوسرے کو کچلتی فرسٹ ایئر اندھا دھند باہر کی جانب بھاگی تھی۔ شاید ہی کسی نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہو کہ ان کی ہونتی سیکنڈ ایئر قہقہے مار مار کر کیسے انجوائے کر رہی ہے۔ عروسہ نے کرٹل جار کے فارملن میں حیرتی آنکھوں پر اپنا ناخن بجا کر کہا تھا۔

”یاد ہے لاسٹ ایئر، یہ دیکھتے ہی میرا تو سانس رک گیا تھا۔“

ہادی نے دروازے کے ساتھ رکھے اور بیکسل skeleton (ڈھانچہ) کی چہرے کی ہڈی پر پیار سے چٹکی کی بھری۔

”ہاں بھئی اب تو تمہیں ان سے عشق ہو گیا ہے۔“

ان کا پہلا دن ویسا ہی گزرا تھا جیسا ہر ادارے میں نئے آنے والے بچوں کا گزرتا ہے۔ سینئرز کا حد سے زیادہ ragging (مذاق) کرنا یہاں تک کہ بچے رو دینے والے ہو جائیں مگر ان کے مذاق کی حد تمام حدود سے باہر تھی، جہاں فرسٹ ایئر کا کوئی بچہ دکھائی دیتا بوتل میں جن کی طرح حاضر ہو۔ سیکنڈ ایئر کے دو تین بچے انہیں گھیر لیتے۔ کسی کو اوور آل الٹا پہنا کر گھماتے، کسی کا اسٹیٹھو اسکوپ پکڑ کر معائنہ شروع کر دیتے، لڑکا لڑکی کی تمیز کو بالائے طاق رکھ کر انسانی اعضا کے ایسے پوشیدہ سوال کیے کہ بچپاروں کی آنکھوں میں پانی تیر گیا، ایک دوسرے سے نگاہ چرانے لگے۔ اوپر سے ان کی حالت پر سینئرز کے ٹھٹھے۔ دوصحت مند بچوں کو پکڑ کر بلڈ بنک لے جانے لگے تھے۔

”چلو چلو امیر جنسی ہے بلڈ دینا ہے۔“ خون نکلنے کے نام سے ہی سب کی جان نکل گئی تھی۔ یک آواز بولے تھے۔

”خون ل ن ن۔“

”جی۔ بیٹا خون۔ جب شہر میں ایمر جنسی ہوتی ہے، سب سے پہلے میڈیکل کے اسٹوڈنٹ ہی لائن بنا کر جاتے ہیں خون دینے۔“ فرسٹ ایئر کی مریم خاصی دبو لگی تھی بخشتہ کے پیچھے چھٹی آہنگی سے بولی۔

”یار کیا پتا تھا یہ میڈیکل تو ایک بلا کا نام ہے، خون بھی چوسے گی۔“

”میرے تو باپ کی توبہ جو آئندہ کسی کو ایم بی بی ایس کا مشورہ دوں۔“

ردا بھی روہانسی ہو گئی تھی۔

”مجھے تو قسم سے شوق ہی نہیں تھا، سب میرے اماں ابا کا کیا دھرا ہے۔“

یہ وہ بریرہ تھی جس نے پہلی بار انٹری ٹیسٹ میں ناکامی کے بعد رور و کر گھر بھر کی بھوک ہڑتال کروادی تھی۔

ایرا غیر اہر کوئی اس کی فکر میں دبلا ہوا اس کے داخلے کی دعا کرتا تھا اور اب کیا تجاہل عارفانہ پایا۔

”ابا کا کیا دھرا۔“ عقیفہ نے بہت آہنگی سے جواب دیا تھا۔

”ابا یا اماں، جس کا بھی کیا دھرا ہے، بیٹا اب آگئے، بھگتنا تو ہم نے ہے۔ کاش پہلے پتا ہوتا۔“

بخشتہ نے خود کئی بار سوچا تھا اس کا فیصلہ درست بھی تھا یا غلط۔ شاید وہ واپسی کا ارادہ کر رہی لیتی اگر ہادی کچھ دیر میں اس کی فائل واپس دینے نہ آتا۔

”یہ آپ کی فائل۔ اب تو ایڈمن آفس بند ہو گیا ہے، کل فائل کے ساتھ سب میٹ کروادینا۔“

”اچھا مذاق ہے۔“ بخشتہ کو غصہ تو بہت آیا تھا اور جی کیا کھری کھری سنا دے لیکن اتنے گھنٹوں میں سب لوگ یہ باور کروا چکے تھے۔

”اگر سینئر سے بگڑ گئی، سمجھو ایم بی بی ایس مشکل ہو گیا۔“

اور یہ بات غلط بھی نہیں ہے میڈیکل میں اتنا استاد نہیں پڑھاتے جتنا سینئرز سمجھا دیتے ہیں، اور اگلے دن ہونے والی orientation (افتتاحی تقریب) میں othh (حلف) کے بعد پرنسپل نے واضح الفاظ میں سمجھا دیا تھا۔

”ragging (مذاق) ہر یونیورسٹی سکول کالج میں چلتی ہے، نیچرز منع کر دیں تب بھی لیکن میڈیکل ایسا

ادارہ ہے جہاں استاد خود چاہتے ہیں سینئرز بچوں کے ساتھ خوب گھل مل جائیں تاکہ ان کا خوف ہر طرح کی جھجک چند دن میں نکل جائے، ہمیں ایک ہفتے کے اندر تیار بنچے چاہیے ہوتے ہیں جو سب کے بیچ میں اٹھ کر بلا جھجک ہر طرح کا سوال کر سکیں۔ یہ میڈیکل ہے، اس میں شرم و جھجک نہیں چلتی۔ gender (جنس) کو آپ ایک طرف رکھ دیں، آپ نے ساری باڈی پڑھنی ہے اور سب کے ساتھ پڑھنی ہے۔۔ اس لیے سینئرز جو کچھ کہہ رہے ہیں مائنڈ مت کریں۔ از اسٹ کیلیر؟“

دل سے تو شاید کسی کے بھی کچھ نہ نکلا ہو، سوائے پچھتاوے اور ایک دوسرے کو کہنی کے ٹہو کے مارنے کے مگر زبانیں خود ہی کہہ گئیں۔
 ”ایس کیلیر۔“



شروع کے چند دن تو خیر بہت ہی جھجک رہی تھی لیکن پھر وہ آہستہ آہستہ اس روٹین کے عادی ہونے لگی، سینئرز کا رویہ بہت ہمدردانہ ہو چکا تھا اگر کوئی ہلکا پھلکا مذاق کر لیتے اس کے بعد ٹاپک کو سمجھانے میں پورے دل سے مدد کرتے تھے۔ کئی نے تو اپنی بکس تک جو نیوز کوڈی تھیں بکس کا بھی عجیب قصہ تھا۔ جب پہلی بار کھول کے دیکھیں، آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ یہ تو پہلے ہی معلوم تھا ایم بی بی ایس کی بکس بہت موٹی اور مشکل ہوتی ہیں لیکن اندر سے کیسی ہوتی ہیں یہ تو کھول کے پتا چلا تھا پہلے ویک اینڈ کے بعد جب رد آئی تھی بہت مزے لے کر کہہ رہی تھی۔

”یار! میرے بیگ کا پہرہ مجھ سے زیادہ میری اماں نے دیا تھا، کہیں میرے چھوٹے بہن بھائی کوئی بک نہ کھول لیں۔“

سب کے مشترکہ قہقہے میں بریرہ چپ رہے ناممکن۔

”اور میری دادی کی اچانک نظر چلی گئی، یقین کرو استغفار پڑھتے ہوئے وضو کیا۔ دو نفل صلوٰۃ توبہ پڑھ ڈالی اور مجھے کہہ رہی تھیں، بریرہ صبح شام کلمہ ضرور پڑھ لیا کر، ڈاکٹر تو، تو بن جائے گی پر اللہ جانے مسلمان رہے گی بھی یا نہیں، جیسی تیری کتابیں ہیں، استغفر اللہ۔“

”اور میرے ابا کی سنو۔“ مریم چکی۔ ”انہوں نے جتنے فخر سے کتاب اٹھائی کہ میری بیٹی ڈاکٹر بن رہی ہے اتنی کھیاہٹ سے واپس رکھ دی، پہلے ادھر ادھر چورنگا ہوں سے دیکھ، لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھتے کمرے سے نکل گئے۔ ہا ہا۔“

بخشتہ کسی بات میں نہیں بولی تھی۔

”تمہیں کیا ہوا؟“ بریرہ نے اسے کہنی سے ٹھوکا دیا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ ایک تو وہ پہلے ہی اپنے لباس، لب و لہجے سے مختلف لگتی تھی اوپر سے اپنے خاندان کی سوچ کیا بتاتی، بریرہ سے تو صرف کلمہ پڑھنے کو کہا تھا اور اس کے باقاعدہ کلمے پڑھائے جائیں گے اگر درخزئی دیکھ لیں؟ اس کا ڈر سامنے آ گیا تھا، دوڑھائی گھٹنے کی مسافت پر واقع گھر پر وہ تین ماہ بعد آئی تھی، حاجی تو اسے دیکھ دیکھ خوش ہو رہے تھے۔ سب نے خوب آؤ بھگت کی سوائے درخزئی کے۔ دن میں گھر والوں کے خوف سے کتابیں کھولی نہیں، اب بندہ سب کے بیچ پڑھ بھی تو نہیں سکتا، پھر ماحول بخشتہ کے گھر والا ہو، اس سے رات کو کسی وقت پڑھتے ہوئے رکھی گئی اناٹومی کی کتاب درخزئی کے ہاتھ لگی، وہ دیکھتے ہی بھڑک گیا۔ قریب ہی تھا وہ اس کی کتاب پھاڑ کر چو لہے کی نذر کر دیتا امروز خان اچانک سے آگئے اور اس کے ہاتھ سے کھینچ لی تھی۔

”یہ کیا کر رہے ہو تم؟“

”فحاشی کی باتیں جلاؤں گا نہیں تو اور کیا کروں گا۔ یہ کچھ سیکھ رہی ہے یہ شہر میں۔“

امروز نے اس کے لال بھبھوکا چہرے کو نخوت سے دیکھا تھا، اگلے دانت جما کر بولے تھے۔

”جو مسئلہ ہم اپنے باپ بھائی کو بھی بتاتے گھبراتے ہیں وہ ڈاکٹر کو بتا دیتے ہیں۔ کیوں؟ کیونکہ ہمیں دوائی چاہیے ہوتی ہے ڈاکٹر اگر یہ سب نہیں پڑھے گا تو علاج خاک کرے گا۔“

”پھر علاج کی باتیں پڑھے۔ تصویروں سے کیا سیکھ رہی ہے۔“

”اوہ خوجہ۔“

امروز اسے گھورتے ہوئے آگے بڑھے تھے اور کتاب اس کے چھین لی۔

”کچھ چیزیں تصویروں اور ڈائیگرام سے سمجھ آتی ہیں۔ تم جاہل کو کیا پتا آٹھویں سے آگے پڑھا ہوتا تو پتا

امروز نے کتاب اسے پکڑا دی اور راستے سے ہٹ گئے تھی۔ درختی نے اپنے گرد لپٹی گرم شال کو غصے میں کھول کر زور سے لپیٹتے بختہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا تھا۔ اس نے نگاہ کا زاویہ بدلیا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پھنکارا تھا۔

”تم ہم کو جاہل ثابت کرنا چاہتی تھیں۔ ہو گئی تسلی۔“

”میں خود کو انسان ثابت کرنا چاہتی تھی۔“

اس کے نرم لہجے پر وہ ناک بھنویں چڑھاتا بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا بختہ کے کان اس کے غصیلے قدموں کی دھمک سنتے رہے۔

”اے اللہ، میرا نصیب اس شخص سے جڑا ہے تو اس کے دل کو بدل دے، اسے کیوں وہم ہے میں اسے جاہل ثابت کرنا چاہتی ہوں۔“

یہ بھی درست تھا درختی تعلیم یافتہ نہیں تھا لیکن ڈگریوں کا ہونا نہ ہونا کسی کا جاہل ہونا کب ثابت کر سکا ہے۔ جاہلیت کا تعلق تو دماغ کے خلل سے ہے اور یہ خلل بعض اوقات بڑے بڑے تعلیم یافتہ خاندانوں میں بھی ظاہر ہو جاتا ہے، کبھی ضد میں کبھی خود کو برتر ثابت کرنے میں اور عورتوں کو پیچھے رکھنے جیسی جاہلیت کہیں بھی مل سکتی ہے اس کے لیے پہاڑی درختی کا ہونا ضروری نہیں تھا۔



فرسٹ ایئر کی یہ تیسری پریزنٹیشن تھی جو اپر لیمب نروسٹم (بازو کا اعصابی نظام) پر پیش کرنی تھی، کلاس کے سی۔ آر۔ کلاس (class)

re-presentative اطہر نے ٹیچر کو فوراً ہی اپنا نام پیش کیا تھا کہ یہ پریزنٹیشن وہ دے گا اطہر کے ماموں اسی کالج میں فیزیالوجی کے ایچ او ڈی (ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ) تھے۔ باپ سرجن، ماں فزیشن۔ پورا خاندان میڈیکل سے وابستہ تھا۔ اس کام بہترین ہونا چاہیے تھا، اطہر نے اپنی پوری کارکردگی سے پریزنٹیشن ایک یو ایس بی میں تیار کی تھی۔ اگلے دن ٹیچر کے کہتے ہی اس نے پورے اعتماد سے اٹھ کر یو ایس بی دیوار میں لگی

ایل ای ڈی میں لگائی۔ اسکرین کے روشن ہوتے ہی سوال ایک ترتیب سے سلائیڈ کی صورت چلنے لگے۔ شارٹ اور لوگ سوال الگ الگ رنگ سے نمایاں تھے، تمام اہم نروڈ کے مختصر فنکشن کو ڈائیگرام کے ساتھ نمایاں کرنے پر ٹیچر نے اسے سراہتی نگاہ سے دیکھا۔

”گڈ ورک۔“ اطہر کے چہرے پر مزید اعتماد لہرایا تھا۔

”آپ نے بہت زبردست طریقے سے سسٹم پیش کیا ہے۔ کیا اسی طرح یاد بھی ہے؟“

”لیس سر۔“

”ہم۔ نائس۔“

انہوں نے اب کلاس سے مخاطب ہوتے کہا تھا۔ ”any question?“

چند اسٹوڈنٹس سوال کرنے اٹھے تھے۔ اطہر نے ان کے کیے سوال پر متعلقہ نروڈ کوریوٹ سے ہائی لائٹ کر کے سمجھا دیا۔ تب ہی نجستہ اپنی زرد چادر کو اچھی طرح سے درست کرتی اٹھی، چشمے سے جھانکتی ذہین آنکھیں اسکرین پر تھیں۔

”سر! اس سارے سسٹم میں میوزیکل نروڈ کون سی ہے؟“

ٹیچر نے وضاحتی نگاہ اطہر پر اٹھائی تھی۔ اطہر کی بھنوں کے دونوں سرے ایسے جڑے تھے جیسے اسے سمجھ نہ لگی ہو۔

”جی اطہر جانتے ہیں آپ۔ کون سا ہے وہ نروڈ؟“

چاہیے تو اطہر کو یہ تھا زبان سے اقرار کرتا۔ ”نہیں۔“

جو بات نہیں پتا اسے مان لینے میں آخر حرج کیا ہے لیکن اکثر اوقات ہم خود اعتمادی کے اس معیار پر کھڑے ہوتے ہیں کہ ہم ہی پرفیکٹ ہیں۔ ہم تصور کر ہی نہیں سکتے کہ کوئی ہمیں ان پرفیکٹ ثابت کر سکتا ہے کچھ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو ہمیں معلوم نہ ہو اور ایسا کرنے میں ہی ہم غلطی کر جاتے ہیں جس طرح اطہر نے کی۔ اس نے تسلیم کرنے کے بجائے مختلف نروڈ بار بار ہائی لائٹ کئے، کبھی کہنی سے کندھے تک کے، کبھی ہتھیلی سے کہنی تک کے، ٹیچر ہر بار ”نو۔“ میں سر ہلا دیتے۔ آخر ٹیچر نے پوری کلاس سے پوچھا تھا۔

“any one know this?”

(کوئی اور جانتا ہے)

سب کے سب خاموش تھے۔ سر نے جستہ سے ہی پوچھا تھا۔

“آپ جانتی ہیں؟”

“نوسر میں جاننا چاہتی ہوں۔”

نیچر حیران تھے جو چیز سلیپس میں ابھی شامل نہیں کسی ساتھی کو پتا نہیں، اسے کیسے پتا؟

“لیکن آپ کو کیسے پتا میوزیکل نرو ہمارے سسٹم میں شامل ہے؟”

یاد تو اسے اچھی طرح تھا لیکن پھر بھی تھوڑا سا گڑبڑا گئی تھی۔ وہ دونوں ہونٹوں کو اندر کی جانب بھینچے پھر سے اٹھی تھی۔

”ایکچو لی سر میں نے دو تین سال پہلے ایک میگزین میں آرٹیکل پڑھا تھا، اس میں میوزیکل نرو کی ٹرم استعمال ہوئی تھی۔ مجھے جاننا ہے آیا کہ وہ ہمارے جسم میں ہوتی ہے یا جسٹ مذاق تھا۔“

”دو تین سال پہلے۔ ہم۔“ نیچر نے سراہتے ہوئے سر ہلایا۔ ”یعنی تب آپ ایٹھ، ناکٹھ میں ہوں گی، گڈ یہ بات آپ کا میڈیکل سے انٹرسٹ شو کرتی ہے، آئی وٹش آپ مستقبل کی قابل ڈاکٹر ہوں گی۔ بیٹھیں آپ سب میں بتاتا ہوں۔“

اطہر اندر تک تلخ ہو گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے اچھی بھلی اس کی تعریفیں ہو رہی تھیں کہ یکدم ایک پینڈولم کی وجہ سے کام میں نقص نکل آیا۔ وہ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے تندی سے جستہ کو دیکھتے بڑبڑایا۔

”یہ مراہیوں کی نہیں ڈاکٹر کی کلاس ہے۔ میوزیکل نرو۔ ہونہ۔“

اس کی چبا چبا کر کی گئی بڑبڑاہٹ نیچر سن چکے تھے۔ انہوں نے بجائے اس اکیلے کو مخاطب کرنے کے تمام کلاس سے کہا تھا۔

”اگر آپ کے کام پر کوئی سوال اٹھتا ہے وہ آپ کی ناکامی نہیں بلکہ اس کام کی کامیابی ہے جس کی وجہ سے آپ سمیت تمام کلاس کو سیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ اوکے۔“

تمام بچوں نے اثبات میں سر ہلائے مگر اطہر نے خجستہ کو کئی بار کٹیلی نگاہ سے دیکھا تھا۔
”اس کی وجہ سے۔“

خجستہ پوری توجہ سے اسکرین دیکھ رہی تھی جہاں سر پہلی دو انگلیوں کے نچلے نرود کو ہائی لائٹ کرتے سمجھا رہے تھے کہ یہ کہاں سے کہاں تک جڑے ہوتے ہیں اور ان کی کس حرکت کی وجہ سے میوزیکل نرود کہا جاتا ہے، اطہر تب متوجہ ہوا جب سرنے بات ختم کرتے ہوئے بہت آرام سے کہہ دیا تھا۔

”یقیناً سب کو کلیئر ہو گیا ہے۔ اب کل اسی سسٹم پر اسٹیج ہوگی، خاص کر میوزیکل نرود پر خوب ریسرچ کر کے آئے گا۔“

پیریڈ ختم ہوا، سر کے پیچھے سب ایک ایک کر کے باہر نکل گئے۔ اسٹیج، میڈیکل میں وہ ضروری ٹیسٹ ہیں جنہیں اگر کلیئر نہ کیا جائے تو پورے سال کا ریکارڈ خراب ہو جاتا ہے۔ اطہر غصے کی وجہ سے توجہ ہی نہ دے پایا تھا اسٹیج کا سن کر مزید خون کھول گیا۔ وہ تیز تیز چلتا جا رہا تھا اسے اپنے آگے زرد چادر والی لڑکی چلتی دکھائی دی اس نے مزید لمبے قدم اٹھائے اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”کس گونیوں کے خاندان سے ہوتم۔ ہاں؟“
خجستہ اچھی خاصی چوٹ گئی تھی۔ آنکھوں میں ہرنی جیسی وحشت در آئی۔
”میرے کام میں آج تک کسی نے نقص نہیں نکالا، تمہاری جرات۔ برداشت نہیں ہو رہی تھی میری پریزنٹیشن۔“

”میں نے نقص نہیں نکالا، میں صرف اپنی کنفیوژن دور کرنا چاہ رہی تھی۔“
”اوہ۔“ اس کے ہونٹ گولائی میں سکڑے۔ ”مستقبل میں طلبے بجانے ہیں۔ تم نے جان کے کیا ہے ایسا۔“
ڈی ایچ کی جانب بڑھتی بریرہ کے قدم ان کی آواز پر تھے، وہ واپس ان کی جانب پلٹی۔
”کیا بات ہے خجستہ؟“

”کچھ نہیں۔“ خجستہ وہاں سے ہٹنا چاہ رہی تھی اطہر بھی ہونہ میں گردن جھٹک کر بڑبڑایا۔
”آ جاتے ہیں پنڈ سے اٹھ کر میڈیکل کالج دیکھنے۔“

بریرہ فوراً ہی سمجھ گئی اور زور سے بولی تھی۔ ”زبان سنبھال کے بات کرو مسٹر اطہر۔“

اطہر نے میکا کی انداز میں سر گھمایا تھا۔

”تمہیں اپنا کیا کام خود نہیں آتا تھا اس میں خجستہ کا کیا قصور ہے۔ اماں تمہاری ڈاکٹر، ابا تمہارے ڈاکٹر، بہن بھائی تمہارے میڈیکل کالجز میں بھرے پڑے ہیں انھیال ددھیال سارا اسی سے منسلک۔ ایک چھوٹے سے نروکا نہیں پتا۔ شیم اون یو۔ تم سے اچھی تو یہ پینڈو ہے جس نے سر تک کو حیران کر دیا۔“

”چلو چلتے ہیں۔“ خجستہ نے بریرہ کو آگے کی جانب پیش کرنا چاہا مگر وہ ڈٹی رہی۔

”کیوں اس کے باپ کا کالج ہے۔“

”تم بیچ میں مت آؤ۔“ اطہر نے انگشت اٹھائی تھی۔

”کیوں نہ آؤں۔ میں جی۔ آر ہوں (girl representative) تم کلاس کی لڑکی کو ہراساں کرو

میں چپ رہوں۔“

ان کی بڑھتی آوازیں بیچ پر بیٹھے سیکنڈ ایئر کے ہادی تک گئیں۔ ہادی اطہر کا بڑا بھائی تھا وہ اٹھ کر فوراً ادھر آیا تھا۔

”فرسٹ ایئر اپنی پرابلم؟“

”نوںو۔“ اطہر نے ایک تلخ نگاہ دونوں لڑکیوں پر ڈالی اور جانے لگا تھا مگر وہاں بریرہ موجود تھی جو بدتمیزی پر اتنی آسانی سے اُسے بخشنے والی نہیں تھی۔

”کیا نوںو۔ بتاؤ نا اپنے بھائی کو، اپنی پریزنٹیشن پر ایک پنڈو کے سوال کا جواب نہیں دے سکے، اب اس لیے اسے تڑیاں لگا رہے ہو۔“

ہادی نے ان تینوں کو باری باری دیکھا تھا۔ اطہر کی کچکپاتی نگاہیں خجستہ پر جمی تھیں جس کے گال گھبراہٹ سے مزید سرخ ہو رہے تھے جیسے ابھی ابھی ہونٹ پڑے گا۔

”بہت بری بات اطہر۔ تم میڈیکل کے اسٹوڈنٹ ہو۔ یہ ایک ٹیم ایجوکیشن ہے، لڑ جھگڑ کر تو کچھ بھی سمجھ نہیں آئے گا۔ چلو سوری کرو خجستہ سے۔“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔“

خجستہ کے ماتھے پر وحشت کے بل تھے اس نے بریرہ کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھتے سرا سیمگی سے کہا تھا۔
”چلو بھی اب۔“

”رکو۔ ابھی وہ سوری کرتا ہے۔“

بریرہ بڑبڑائی۔ پھر اپنے ہاتھ اور آل میں ڈالتے تجاہل عارفانہ سے کندھے اچکائے۔

”چلو اب جلدی کرو سوری، ہمیں کینٹین بھی جانا ہے۔ بی پی ہائی کر دیا میرا۔ اب جوس شوس پیس جا کر۔“
”سوری اور میں اس جنگلی سے۔ مائی فٹ۔“

اس کے رویے پر ہادی نے سرزنش کی تھی۔

”اطہر۔“

اطہر کی جانے بلا، وہ ناک بھنویں چڑھاتے اگلے دانت جما کر بریرہ کو کہہ گیا تھا۔

”دیکھ لوں گا تمہیں میں، اور تمہیں بھی۔“

دوسرا جملہ خجستہ سے کہا۔ وہ اندر تک لرز گئی تھی

”دیکھا آپ نے اپنے بھائی کے رویے کو۔“

بریرہ کے شکایتی انداز پر وہ قدرے غصے سے بولی۔

”بس کر جاؤ بریرہ۔“

اسے اپنی آواز کا نپتی ہوئی محسوس ہوئی وہ وہاں سے ہٹ جانا چاہتی تھی بریرہ نے اسے روکا۔

”کہاں جا رہی ہو۔ کینٹین چلتے ہیں۔“

”نہیں، میں ہوٹل جا رہی ہوں۔“

”رکیں پلیز۔ ایم سوری، میں سمجھاؤں گا اسے۔ اور چلیں میں آپ کو کینٹین لے چتا ہوں۔“

”نہیں شکریہ۔“ وہ اب پہلے سے بھی تیز قدموں سے ہوٹل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ بریرہ اسے آوازیں

لگاتی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

”بخشتہ رکو۔ رک جاؤ۔“
مگر اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔



امروز خان کو اس پر آج معمول سے زیادہ غصہ تھا، اس کے انتظار میں بہت دیر درپے میں ٹھلکتے رہے، دو تین بار اس کے کمرے میں جھانک آئے، رات کے دس بجنے کو تھے مگر وہ ابھی تک گھر سے باہر تھا، اس کا بڑھتا لا ابالی پن امروز خان کو تپا کر رکھ دیتا، آج صبح ہی وہ اسے سختی سے کہہ کر گیا تھا۔

”پہلے ٹائم ہے، زمین پر آ جائے۔“

مکئی کے بیج ڈالے جا رہے تھے امروز خان کو کھاد کے سلسلے میں انک شہر جانا، اس کی غیر موجودگی میں مزارعوں پر کوئی تو نظر رکھے مگر درخزئی کی بلا سے۔ امروز کے گھر سے نکلتے ہی وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر نکل گیا۔ رات ہونے کو آگئی ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ امروز کتنی دیر ٹھل ٹھل کر اس کا انتظار کرتا رہا، رات کو تو اس سے ملاقات نہ ہو سکی مگر صبح ہوتے ہی اسے اڑے ہاتھوں لیا تو وہ بھی اکڑ کر بولا۔

”ہم مرد کا بچہ ہے، شکار نہیں کرے گا تو دشمنوں کا مقابلہ کیسے کرے گا۔“

”کون سے دشمن کا مقابلہ کرنا ہے تم نے۔“ امروز خان نے لتاڑا تھا۔ ”خوچہ! اصل دشمن یہ پیٹ ہے، اس کا مقابلہ کرو۔“

امروز ایسے کھانے کو پڑا تھا، سیف خان گھر پر نہیں تھے مگر خانی اور صفورا درمیان میں آ گئیں۔
”اسی لیے ہم کہتا تھا اس کی شادی کر دو، ذمہ داری میں خود عقل آ جاتا ہے لیکن نہیں، تم نے بخشتہ کو شہر بھیجا ہے۔ اب بھگتو۔“

امروز نے اگلے دانت جما کر نخوت سے اسے گھورا۔

”بخشتہ سے شادی کرنی ہے تو پہلے انسان کا بچہ بنے، ورنہ اس کا خیال دل سے نکال دے۔“

خانی اور صفورا دونوں نے ہونٹوں سے امروز کو دیکھا تھا جیسے کسی مرتد کو دیکھ لیا ہو۔

”یہ تم کیا کہہ رہا ہے۔ امروز خان۔ ان کا بچپن کا رشتہ ہے اور بچپن کا رشتہ مرتے دم تک چلتا ہے۔“

”اور کیا۔“ خانی بیگم نے صفورا کی تائید کی۔ ”ہم کو نہیں اسے پڑھانا اور ہانا۔ بلاؤ اسے اور شادی کروان کا۔“

ڈری ڈری زربخت بھی دروازے میں کھڑی ساس اور ماں کی حمایتی لگ رہی تھی۔ امروز نے بیچارگی بھری نگاہ ان عورتوں پر ڈالی اور ایک بار پھر اسے انگشت سے تنبیہ کی تھی۔

”آئندہ میں آوارہ پھر تانہ دیکھوں ورنہ۔“ اس نے غصے سے گردن جھٹکی۔ ”شکر کرو تمہارے نام ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے، ورنہ تم جاہل کو۔“

آخری لفظ اسے گالی سے بھی زیادہ کاٹ دار لگا۔ اس کا دل کیا ایک قبر کھودے اور خستہ کو اس کی تمام کتابوں، ڈگریوں سمیت دفن دے، جس کی وجہ سے اب اس کو باقاعدہ جاہل کی سند مل چکی تھی۔



کئی دن خاموشی سے سرک گئے تھے۔ ہادی نے اطہر کو سمجھایا تھا یا نہیں لیکن اس کا رویہ اب بالکل سرد تھا، اس کے رویے پر شروع کے کئی دن وہ اچھی خاصی ڈسٹرب رہی تھی۔ وہ لڑکا ہے کچھ بھی غلط کر سکتا تھا۔ اسے رہ کر بریرہ پر غصہ آ رہا تھا۔

”اگر تم چپ کر جاتیں اچھی بھلی بات ختم ہو جاتی مگر تم نے اس کے بھائی کو ضرور بتانا تھا۔“

”کیوں چپ کر جاتے، گونگے ہیں ہم۔؟“ بریرہ اس سے متفق نہیں تھی۔ ”اور تم خواہ مخواہ اس سے ڈر کر

آگئیں، نا کوں چنے نہ چہوادیتی اس کو پھر کہتیں۔ ریں ریں کرتا پاؤں پکڑتا۔“

”تم یہ سب کہہ سکتی ہو، بریرہ۔“ ردا ابھی کمرے میں آئی تھی۔ آتے ہی موضوع گفتگو سمجھ گئی۔ ”تمہاری اور خستہ کی فیملی میں بہت فرق ہے۔“

”کیا فرق ہے، میری فیملی نے مجھے آوارہ چھوڑ رکھا ہے، جس مرضی سے سر پھوڑوں۔ میں نے جائز بات کی ہے۔“

”تم اپنے نظریے سے جائز سمجھ رہی ہو بریرہ لیکن میری فیملی کے نظریے کچھ الگ ہیں۔“

خستہ گھٹنے اکٹھے کر کے ان کے گرد بازو لپیٹ کر بیٹھ گئی۔ لہجے میں بہت تھکن اتر آئی تھی۔ ”ہمارے ہاں

عزت پر وضاحتیں نہیں سنی جاتیں، صرف ایک زبان میں بولا اور سنا جاتا ہے۔ بندوق کی زبان میں، لڑکیوں کے معاملے میں بحث تکرار بالکل نہیں چلتی۔ تم کیوں نہیں سمجھتی، اور ویسے بھی وہ لڑکا ہے، بریرہ۔“

”تو ہم لڑکیاں ہیں، وہ سمجھ جائے۔“ بریرہ اسے جتا کر بولی لیکن خجستہ کی پریشانی دور نہیں ہوئی تھی تب ہی اس نے اسے پیار سے سمجھایا تھا۔

”لڑکوں کو ان کی حد میں رکھو تو یہ ٹھیک رہتے ہیں، ورنہ انہیں دیر نہیں لگتی اپنی اوقات بھولنے میں۔ اور تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کسی بندوق وندوق سے۔ وہ کسی سے کچھ کہے تو سہی، اس کی ہڈیاں توڑ کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دوں گی یا ہڈیوں کی مالا بنا کر اس کے گلے میں نہ ڈال دی پھر کہنا۔“

جس انداز میں اس نے کہا تھا، کتاب پر جھکی مریم اور روانہستی ہوئی دوہری ہو گئیں۔

”ویسے تمہارے ارادوں سے لگتا ہے یار، تم آرٹھوپڈک ہی بنو گی۔“ ان دونوں کے قہقہوں میں عقیفہ جونئی نئی سہیلی بنی تھی بولی تو خجستہ کا موڈ کچھ دیر کو سہی مگر بدل گیا تھا اور پھر سب معمول کی طرح چلتا رہا۔ چھوٹی موٹی بد مزگیاں اسٹوڈنٹس میں ہوتی رہتی تھیں، پڑھائی میں گم ہو کر سب بھول جاتے تھے۔ اطہر بھی یقیناً بھول چکا تھا، اس کا سر درویدہ آہستہ آہستہ پکھلا اور روٹین پر آنے لگا، خجستہ بھی بھول گئی۔



دن بھادوں کی بوندوں کی مانند برس رہے تھے، جیسے جیسے پہلے سال کے امتحانات قریب آنے لگے، بچے اپنا التوا میں پڑا کام سمیٹ رہے تھے، ان کی osphy (ڈیڈ باڈی یا اس کے ماڈل پر جسم کے متعلقہ ٹشوز یا سسٹم کی پن لگا کر نشاندہی کرنا) کی کچھ تیاری رہتی تھی جس کے لیے ان کے ٹیچرز نے انہیں بار بار ڈائی سیکشن (ڈیڈ باڈی پر پریکٹیکل) کرنے کا کہا تھا۔ سی۔ آر نے بارہ بارہ بچوں کے ٹیچ بنا رکھے تھے۔ ہر بیچ ڈی ایچ (ڈائی سیکشن ہال) جاتا اپنا کام کر آتا، خجستہ اپنے بیچ کے ساتھ نہیں جاسکتی تھی۔ اس کے ہوسٹل کے کچھ ڈیوزر رہتے تھے اسی سلسلے میں اسے بنک جانا تھا۔ بنک کی براؤنج وہاں کالج میں ہی تھی لیکن پھر بھی اسے کچھ ٹائم لگ گیا۔

وہ اگلے دن بیچ بی کے ساتھ چلی گئی تھی۔ اوور آل، سرجیکل گلووز اور ماسک پہنے تیرہ بچے ڈائی سیکشن ٹیبل کے گرد کھڑے تھے ان کے سامنے ہی لیب انٹینڈنٹ نے فارملن بکس کھولا۔ پورا ڈی ایچ فارملن کی بو سے مہک گیا۔

شروع شروع میں یہی بساںد اس قدر ناگوار لگتی ہے ڈی ایچ سے باہر نکلتے ہی بچے ماسک اتار کر سینے پر ہاتھ رکھے زور زور سے ایسے سانس کھینچتے ہیں جیسے دے کے مریض پر فضا مقام پر آگئے ہوں مگر وقت کے ساتھ وہ بساںد معمول کی مہک میں بدل گئی۔ بریرہ نے تو کئی بار بخستہ سے کہا بھی تھا۔

”یار لگتا ہے ڈیڈ باڈی نہالی ہے، اب بو نہیں آتی۔“

اس کے پیچھے کھڑے سرزابد نے سنا تو پیار بھری چیت اس کے کندھے پر لگائی۔

”میرے بچو! اب تمہیں ساری زندگی کوئی بو نہیں آنے لگی، آل ریڈی اتنی بوتہارے اندر اتر چکی ہے۔“

اس وقت بھی مسئلہ بو سے نہیں بلکہ فارملن کی چیچپا ہٹ سے ہوا تھا۔ ہوا کچھ یوں تھا باڈی کے ٹیبل پر رکھتے ہی سیکنڈ ایر کے کچھ اسٹوڈنٹس ڈی ایچ میں داخل ہوئے تھے، انہیں باڈی کا کچھ حصہ چاہیے تھا۔ فارملن سے بھیگی باڈی دیکھ کر ہادی نے ملاحتی نگاہ سے لیب اسٹینڈنٹ کو دیکھا تھا۔

”سر! آپ کو پتا بھی ہے، ڈائی سیکشن سے ایٹ لسٹ پانچ، چھ گھنٹے پہلے باڈی ٹیبل پر شفٹ ہوتا کہ فارملن اڑ جائے۔ اتنی چیچپا ہٹ میں یہ کیسے کام کریں گے۔“

لیب اسٹینڈنٹ پہلے ہی اکتایا پڑا تھا، روز سامان نکالو پھر صاف کر کے اس کی جگہ پر پہنچاؤ اوپر سے کبھی کسی ٹیچر سے ڈانٹ کبھی ایچ او ڈی سے، آج اسٹوڈنٹ بھی نقص نکالنے لگے وہ چڑ کر بولا تھا۔

”یہ کون سا بتا کر گئے تھے، چھریاں چاقو پکڑ منہ اٹھائے آگئے۔۔۔ چیر پھاڑ کرنی ہے، ہونہہ۔“

وہ کہہ کر سیکنڈ ایر کی فارہ کی بات سننے لگا جو ڈائی کٹر (آرے نما اوزار) مانگ رہی تھی اسے باڈی کا سر کاٹ کر برین (دماغ) کے نروز پڑھنے تھے۔ ہادی، اطہر کو دبی آواز میں ڈپٹنے لگا۔

”اتنے غیر ذمہ دار مت بنو اطہر، تم سی آر ہو، شیڈول اسٹینڈنٹ کو کیوں نہیں دیا۔“

اس سے پہلے اطہر صفائی میں بڑبڑاتا وہ ایسا ہی تھا اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کے بجائے ڈیفنڈ کرنے والا۔ ڈاکٹر زابد ہال میں داخل ہوئے اور سیکنڈ ایر کو وہاں دیکھ کر مسکرا دیئے۔

”ایسا ہے سیکنڈ ایر، ایک ایمر جنسی میں مجھے ہاسپٹل پہنچنا ہے، آپ فرسٹ ایر کو ڈائی سیکشن کروادیں۔“

انہوں نے باڈی کی پنڈلی کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہ lower lamb کروانا ہے۔“

سیاہی مائل برین نکال کر سٹیل کی ڈیش میں رکھتی فارہ جلدی سے بولی تھی۔

”سراہادی کروادیں گے، مجھے یہ لیب میں لے جانا ہے، سرائیس میرا ویٹ کر رہے ہیں۔“

فارہ کہہ کر فوراً سے کھسکی تھی۔ ہادی سر تسلیم خم کرتا آگے بڑھا اور ڈائی سیکشن کیٹ سے ایک کٹڑاٹھا کر پنڈلی کی جانب ہوا۔ سب بچے اس کے گرد گھیرے کی صورت بھڑ کر قریب ہوئے تھے۔

”ذرا فاصلہ تو رکھو، مجھے ہاڈی پر گرانا ہے۔“

”ہاں بھئی ذرا احتیاط سے اور مجھے بھی دیکھنے دو ٹھیک بھی کر رہے ہو۔“

ڈاکٹر زاہد وہاں رکھی ایک کرسی پر ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھ گئے۔ کیونکہ انہیں ہاسپٹل سے پھر فون آچکا تھا اب ان کی وہاں ضرورت نہیں۔ ایمر جنسی کنٹرول ہو چکی ہے۔ وہ ایک ایک بچے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ ہادی دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے میں کٹر پکڑے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے جلد دبا تا کسی ماہر قصاب کی طرح ہاڈی کی پنڈلی پر کٹ لگا رہا تھا۔ اس میں اور قصاب میں صرف اتنا فرق تھا ذبیحہ کی کھال نرم اور گرم ہوتی ہے جو تھوڑی سی مشقت سے اتر جاتی ہے جب کہ سال بھر سے رکھی ڈیڈ ہاڈی کی جلد اکڑ کر کسی درخت کی سخت چھال جیسی ہو چکی ہوتی ہے، جسے احتیاط سے اتارنے میں دائیں ہاتھ کی انگلی اور بائیں کے انگوٹھے کا اتنا زور لگتا ہے بعد میں ہاتھ کتنی دیر سہلانے پڑتے ہیں یہ ڈاکٹر ذی جانتے ہیں۔ اس نے کچھ حصے پر کٹ لگا کر سیاہ جلد اتاری، اندر سے زردی مائل جسم جھلکنے لگا، ڈیڈ ہاڈی کا گہرا زرد رنگ اس لیے ہو چکا تھا خون کے خلیات ختم ہو کر ضائع ہو چکے تھے، ان ضائع شدہ خلیات میں ہی وہ مختلف نروز انہیں بتاتا رہا۔

”ہادی! اب آپ ہٹیں، باری باری ان سے کروائیں۔“

ڈاکٹر زاہد کی حکم پر اس نے اثبات میں سر خم کیا۔ اطہر کو آگے آنے کا اشارہ کرتے کٹڑ وہاں رکھا، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر بنا مڑے بندھے ہاتھ اوپر کو اٹھاتا پیچھے ہوتا گیا۔ اس کی جگہ اطہر نے لی۔ مزید حصہ چاک کرتا وہ بھی نروز اور آرٹریز بتا رہا تھا، سر نے اب اسے جانے کا اشارہ کیا تا کہ دوسرا آ سکے۔ وہ کٹڑ وہاں رکھ کر پیچھے ہونے کے لیے مڑا، خستہ اس کے بہت قریب کھڑی تھی اس کے ہاتھوں کی چیچھا ہٹ پر وہ کراہیت آمیز پیچھے ہوئی۔

”ہاتھ اوپر کریں، آپ کے ہاتھوں سے فارمن ٹپک رہا ہے۔“ ڈاکٹر زاہد کو یک لخت غصہ آ گیا تھا وہ زور سے پکارے تھے۔

”اطہر۔ آپ نے ہادی کو فالو نہیں کیا۔ وہ کیسے پیچھے ہٹے تھے۔“ وہ کھسیانا ہو گیا۔ ”ہاتھ جوڑیں، اور اوپر کو اٹھائیں۔“

اس نے انگلیاں آپس میں پھنسانیں ہاتھ اوپر کو اٹھائے۔

”بنا مڑے پیچھے ہوں۔۔ جا کر سینٹرز سے ہاتھ دھوئیں۔“

وہ پیچھے ہوتا گیا۔

”آپ ڈاکٹر بن رہے ہیں یا گدھے۔ پتا ہے، کتنی انفیکٹیڈ ہوتی ہے ڈیڈ باڈی، ذرا سی بے احتیاطی سے کتنا انفیکشن پھیل سکتا ہے۔ پورا سال ختم ہونے کو ہو گیا ابھی تک ڈائی سیکشن کرنی نہیں آئی۔ آئیں ہیں ڈاکٹر بنے۔ تم سے زیادہ احتیاط مرغی کاٹنے قصاب کر لیتا ہے۔“

سرزاہد کی مسلسل ڈانٹ اور بچوں کی کھسر پھسر پر اطہر کا دل کیا ڈیڈ باڈی کی جگہ نجستہ کولٹا کر اس کی چیر پھاڑ کر دے۔ اس وقت اس نے خود کو بہت مشکل سے قابو کیا تھا۔ نجستہ کو بھی اندازہ نہیں تھا اچانک سے ادا ہوا جملہ کوئی مشکل بھی پیدا کر سکتا ہے۔ کلاس کے ختم ہونے پر اس نے اسے صرف اتنا کہا تھا۔

”تم نے جان کر اپنا بیج مس کیا تھا تا کہ میرے ساتھ پنکالے سکو۔ اب میں تمہیں اس کا مطلب بتاؤں گا، اطہر چیز کیا ہے۔“

دھمکی سے نجستہ کی پوری جان لرز گئی تھی۔



اس واقعے کے بعد اطہر کو پچھلی بات بھی بے طرح کھٹکنے لگی تھی۔ اسے موقع نہیں مل رہا تھا کس طرح بدلہ لے۔ پیپرز میں گنتی کے دن تھے اور ہوسٹلز میں موت کا سنا سنا۔ حالانکہ تعداد معمول سے زیادہ تھی۔ عموماً میڈیکل کالج میں اسی شہر کے بچے آٹھ دس نہ ہونے کے برابر ہی ہوتے ہیں اور پیپرز میں وہ بھی ہوسٹل آ جاتے ہیں کیونکہ تنہا تو ایک ٹاپک بھی یاد نہیں کیا جاسکتا گروپس میں بیٹھ کر تیاری ہوتی ہے اور دو، دو دن مسلسل جاگ کر

بھی بغیر چیٹنگ کے پورا پیپر کرنا بے حد مشکل ہے، تمام بچے اپنی پوری تیاری کے ساتھ ایڈیٹورم پہنچ چکے تھے اور ایک دوسرے کو بریف کر رہے تھے، انہیں مزید سمجھانے کے لیے سیکنڈائیر نے بھی چکر لگائے۔

”چیٹنگ کا کیا سوچا ہے؟“

سیکنڈائیر کی فارہ کی بات سن کر سب ایک دوسرے کا منہ ٹکٹے لگے تو ہادی بول پڑا۔

”اتانیک یہاں کوئی نہیں کہ چیٹنگ نہ ہو۔“

ساری سیکنڈائیر نے نفی میں سر دھنتے اس کی تائید کی۔

”ناممکن۔“ ہادی بتانے لگا۔

”آپ سب ایک کلاس ہو، پوری کوشش کرنی ہے سارے ساتھی پاس ہو جائیں لیکن منہ سے بول کر نہیں خاموشی سے، کوڈز میں، اور اگر بوٹیاں شوٹیاں ہیں تو یہاں ہی نکال دو، پکڑے گئے، میڈیکل سے باہر ہو جاؤ گے وہ بھی بے عزتی کے ساتھ۔ بس مدد، مگر خاموش“

کچھ ہی مشورے سے خاموش کوڈز طے پا گئے تھے، اطہر نے سوالوں کا کوڈ جوتا بجانا بتایا تھا، یعنی جس نمبر کا سوال نہیں آ رہا وہ اتنی بار اپنا پاؤں زمین سے ٹکرائے گا۔ میڈیکل کا پیپر تقریباً معروضی ہوتا ہے، چار آپشن سے ایک درست، جواب کا کوڈ بریرہ نے بتایا جسے جواب آتا ہو۔ وہ درست آپشن پر کھانے گا، یعنی آپشن اے تو ایک بار کھانا سنا ہے، بی تو دوبارہ، اسی طرح ڈی تک۔

ہال میں پہنچتے ہی پیپر شروع ہوا۔ کچھ دیر خاموشی سے پیپر ہوتا رہا پھر تو ہال کے ایک کونے سے کبھی کھانسی ابھرتی، کبھی جوتے ٹکراتے، U.H.S سے آئے ایگزیمینز کچھ دیر برداشت کرتے رہے پھر اپنا ماضی بھلا کر گرے۔

”آج سارے استعما اور مرگی کے مریض پیپر دے رہے ہیں، جو سانس نہیں آ رہا، ایڑیاں رگڑی جا رہی ہیں۔ خاموش ہو کر کام کرو ورنہ چھن لوں گا سب سے۔“

پھر تو جس بیچارے کو سچ مچ کھانسی آرہی تھی اس نے سانس بھی روک لیا، اطہر، خستہ سے ایک قطار کے فاصلے پر تھا، اسے اندازہ ہوا تھا وہ خاموشی سے پیپر کر رہی ہے یقیناً درست بھی، وہ چوتھے سوال پر بری طرح اٹکا

ہوا تھا۔ اس نے رک رک کر چار بار جوتا بجا کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی، وہ ہوئی بھی لیکن ایگزیمز کے خوف سے کھانسا اسے محال لگ رہا تھا۔ اس نے دوبار اسے ہنٹوں سے بھی اشارہ کیا شاید بتا دے، آپشن بھی ڈی تھی چار بار کھانسا، اف! اس نے کھانسنے کے بجائے ہتھیلی پر لکھ کر اس کے سامنے کر دی۔

”آپشن ڈی۔“

عین اسی وقت ایگزیمز نے اسے ہتھیلی دکھاتے دیکھ لیا فوراً اس کے پاس آ گئے۔

”اسٹینڈ اپ۔“

دنیا کی تمام ہونٹیں اس وقت خجستہ کے چہرے پر تھیں، منہ وحشت سے واہ ہو گیا۔

”کیا لکھا ہے ہاتھ پر؟“

”کک..... کچھ نہیں سر۔“ اس نے مٹھی زور سے بند کر لی، اطہر کی بھی سانس رک گئی تھی۔

”پاگل سمجھ رکھا ہے مجھے، دکھائیں ادھر۔“ مٹھی دیکھتے ہی وہ جھنجھنا گئے۔

”کیا ہے یہ۔ کیا بتا رہی تھیں اسے؟“

وہ نفی میں سر ہلاتی رہی۔ سر نے اطہر سے استفسار کیا، لمحہ بھر تو وہ سٹپٹا یا پھر سنبھل کر بولا۔

”سر بتا نہیں رہیں، انکچولی ایک سوال کی آپشن پر یہ کنفیوژ تھیں وہ پوچھی ہے، مگر میں نے بتایا نہیں۔“

اس کی بات سن کر خجستہ کی آنکھیں پھٹیں، آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”نونسر۔ یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ انہوں نے۔“

”میں نے۔ میں کیوں پوچھنے لگا تم سے۔ مجھے تو سب آتا ہے۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر زور زور سے بولنے لگا۔

”خاموش۔“ سر نے زور سے ڈپٹتے ہوئے دونوں کے پیچھاٹھا لیے تھے۔

”ملک کی آبادی آپ سے مروا کر کنٹرول نہیں کروانی، انڈر سٹینڈ۔ اینڈ آؤٹ۔“

دونوں کی منتوں کے باوجود ان کے پیچ پر ”چینگ“ لکھ کر باہر نکال دیا گیا۔



ایک ہفتے سے اس نے رورواپنا برا حال کر لیا تھا۔ سب نے اس کو ملامت کی، آخر لکھ کر پوچھنے کی ضرورت کیا تھی، جو تباہی جیتی، کم از کم اس حرکت کا کوئی ثبوت تو نہیں ہوتا ناں، اپنی صفائی میں وہ کچھ نہیں بولی تھی، بس چیونگ جیسی بدنامی کا بے حد دکھ تھا۔ اس سے زیادہ دکھ اور حیرت اس کے ٹیچرز کو ہوئی تھی جب ایک ماہ بعد رزلٹ آیا۔ بائیو کیمسٹری میں سوائے چند نالائق اسٹوڈنٹ کے تمام کلاس پاس تھی، اطہر کی سہلی آجانا کوئی معنی نہیں رکھتی تھی باقی دو سبجیکٹ میں بھی گزارے لائق نمبر تھے لیکن اس میں خجستہ فیل.....!

وہ خجستہ جو انونامی جیسے مشکل سبجیکٹ اور فزیالوجی میں ڈسٹنکشن پر ہے، میڈیکل میں اسی فیصد نمبر پر ڈسٹنکشن لگ جانے کا مطلب بچہ اس سبجیکٹ میں گولڈ میڈل کے لیے نامزد ہو چکا ہے، بائیو کیمسٹری کے سر نے حیرت سے پوچھا تھا۔

”خجستہ۔ فیزیو، انونامی میں ڈسٹنکشن۔ باؤ کیم میں کیا ہو گیا تھا آپ کو؟ ایم کنفیوژڈ۔“

اس کے جواب دینے کے بجائے پیچھے سے کسی کی گنگناہٹ سے ہانک آئی تھی۔

”چی..... بھگ۔“

”اوہ نوا!“ سر کے ہونٹ گولائی میں سکڑے۔

خجستہ کے سارے بدن میں ایک لہری سنسنائی تھی جہڑے جم گئے۔

”بہت بری بات۔ آپ لوگوں کو بریف کرنے کے لیے ہم پانچ پانچ بجے تک کالج میں رہے ہیں، ایچ او ڈی تو آٹھ بجے آف کر رہے تھے، اگر کوئی کنفیوژن تھی، بچوں آپ ڈسکس کیوں نہیں کرتے۔ چیونگ کو کیوں پریفر کرتے ہو۔ بہر حال فورٹی ڈیز ہیں آپ کے پاس۔ جس جس کی سہلی ہے کلیئر کر لے، نہیں تو ایم بی بی ایس آپ سے معافی چاہتا ہے۔“

سہلی آجانے کے باوجود اطہر آج اتنا خوش ہوا تھا۔ اسے لگا دونوں بار کا بدلہ ایک بار میں سود سمیت اتر۔



رات کی سیاہی دن کی چاندی میں پھیل کر سنہرا پن بکھرتی رہی، سہلی دونوں کی کلیئر ہو گئی تھی لیکن اس واقعے سے خجستہ نے ایک سبق سیکھ لیا تھا، دنیا میں سب لوگ اس جیسے نہیں ہیں، ہر دوسرے کو پچھاڑنے کی ریس لگی ہے، یا

تو اس دوڑ سے نکل کر ایک جانب کھڑی ہو جائے اور تماشہ دیکھے، یا پھر بھاگے اور تیز بھاگے۔ بن کسی کو دیکھے، بنا کسی کو روکے، اسے بھاگنا تھا مگر کسی کو گرائے بنا۔ روکے بنا، پہلا سال مشکل تھا پھر دل پر لینا چھوڑا تو سب آسان لگنے لگا تھا۔

پہلے دو سالوں کی کلاسیں کالج میں ہوتی رہیں۔ اطہر نے زچ کرنے کی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ تیسرا کلینیکل سال شروع ہوتے ہی پہلے پریڈ کے بعد اسٹیجیو اسکوپ اور آل میں ڈالے فائل اٹھا کر ہاسپٹل چلے جاتے۔ وہاں جا کر پچھڑے سینئرز کے ساتھ یونٹ بن گئے تھے، اطہر اور اس کا یونٹ الگ الگ تھا۔ کم کم سامنا ہوتا۔ پھر اکثر ٹائمنگ کا بھی فرق ہو جاتا، خجستہ کا یونٹ ہادی کے ساتھ تھا۔ اس سے ملاقات ہوتی رہتی تھی، شکل و صورت میں تو بھائی جیسا لمبا چوڑا خوبصورت سا تھا، کچھ تیسرے چوتھے سال میں جاتے ہی ڈاکٹرز کی اتنی گرومنگ ہو جاتی ہے عام سی شکل صورت کے بھی دلکش لگنے لگتے ہیں، لیکن وہ اطہر کے برخلاف اخلاق کا بھی دلکش تھا۔

خجستہ اس کے اخلاق سے متاثر تھی جب کہ وہ پوری خجستہ سے متاثر ہو چکا تھا، باقی لڑکیوں سے مختلف اپنی ذات میں قید مگر ذہن خجستہ، اسے شروع میں ہی بہت اچھی لگی تھی۔ فری وقت میں ایک دوسرے سے ٹاپک ڈسکس کرتے ہوئے وہ اس کی فیملی کے بارے میں بہت کچھ جان گیا تھا۔ یقیناً جاننے میں اسے دلچسپی بھی محسوس ہوتی تھی، اسے اس کے شوق اور ہمت پر حیرت تھی کس علاقے کی ہو کر کتنی دلچسپی سے پڑھ رہی ہے، پھر سب کے بچ چلتے ہوئے مکمل اعتماد بھی۔



درخزئی کا مزاج بدلنا ناممکنات میں سے تھا لیکن امروز اس پر کڑی نگاہ رکھتا تھا، امروز کی سختی، ڈانٹ ڈپٹ پر سیف خان نے انہیں ہی سمجھایا تھا۔

”تم فکر مت کرو، شادی کے بعد خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“

”داجی آپ کو لگتا ہے، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کیوں تمہیں نہیں لگتا۔ ذمہ داری بڑے بڑے کو ٹھیک کر دیتی ہے۔“

”پتا نہیں داجی، مجھے نہیں لگتا۔ خجستہ اور درخزئی میں بہت فرق ہے، مجھے تو اس فیصلے پر افسوس ہوتا ہے۔“

”کس بات کا فرق امروز خان۔“ سیف خان غصے سے اپنا صافا جھٹکتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”اگر خجستہ چار لفظ پڑھ گئی ہے، گھر کے بچے میں تمہیں نقص دکھائی دینے لگے۔ ہم پہاڑی لوگوں کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں، جیسے ہوئے۔ چار کتابیں ہماری روایات نہیں بد سکتیں۔“

سیف خان نخوت سے گردن جھٹک کر جاتے جاتے کہہ گئے۔ ”اس کی ڈاکٹری پوری ہونے والی ہے۔ شادی کے لیے گھر میں جو مرتیں کروانی ہیں شروع کرواؤ تم۔“



وقت کی پھسلن ان لحوں پتا نہیں چلتی جب سب ہموار پر بہہ رہا ہو، رگڑ کا تب پتا چلتا ہے جب سطح ناہموار آنے لگے، اور رگڑیں تکلیف تو دیتی ہی ہیں۔ چار سال تیزی سے گزر گئے۔ یہ ان دنوں کی بات جب خجستہ پانچویں سال میں تھی اور ہادی کا چھٹا ہاؤس جاب کا سال شروع ہو چکا تھا۔ ان کے یونٹس تبدیل ہوئے تھے۔ لسٹ میں خجستہ اور اطہر کا نام ایک یونٹ میں تھا اور اس کا پورا دل تھا۔ اپنا یونٹ کسی طرح تبدیل کروالے۔ بے شک اب ان کے درمیان کبھی کوئی ناخوش گوار بات نہیں ہوئی تھی لیکن خجستہ کی غیر معمولی قابلیت نے اسے تمام ٹیچرز اور اسٹوڈنٹس میں خوب نمایاں کر دیا تھا جو اطہر کے لیے اندرونی حسد کا سبب بن رہی تھی۔ وہ اس کا اظہار لفظوں کے بجائے انداز سے کرتا، اس کی جگہ آمیز نگاہیں اور خاندانی پروفیشن کا رعب خجستہ کے سامنے زیادہ سر اٹھتا تھا۔

یونٹ تبدیل کروانے کے لیے اگر وہ ایچ او ڈی سے بات کرتی مسئلہ تب بھی حل ہو جانا تھا لیکن انہیں سمجھانے کے لیے کئی طرح کی وضاحتیں دینی پڑتیں، ہاؤس جاب کے اسٹوڈنٹس کی ایسے معاملات میں بہت چلتی ہے اس کی ایک اہم وجہ ایمر جنسی میں بائیس بائیس گھنٹے کی ڈیوٹی ہے جو وہ اپنے سینئر ڈاکٹرز کی جگہ دیتے ہیں اور ہادی سے کہتے اسے زیادہ ہچکچاہٹ نہیں ہونی تھی۔

وہ ہادی ہی تھا جو بنا کہے کئی بار کام آچکا تھا۔ ایک بار تو فرشتہ ہی ثابت ہوا تھا۔ خاصی پرانی بات تھی تب خجستہ کا سیکنڈ ایئر ختم ہو رہا تھا۔ اسے ریڑھ کی ہڈی کے آخری مہرے کو پڑھنا تھا، اسی سلسلے میں وہ لیب اینڈنٹ کے پاس

گئی۔ اسے ہاڈی کی ہڈی چاہیے تھی۔ لیب میں اس وقت اس کے تین ماڈل اور ایک اور بجنل رکھی تھی۔ اس کے او بجنل مانگنے پر اینڈنٹ نے کہا بھی تھا۔

”آپ بون کا ماڈل لے جائیں۔ اور بجنل بون کہیں آگے پیچھے نہ ہو جائے۔“

”اتنی لا پرواہ نہیں ہوں میں سر۔ دو تین دن میں واپس کر دوں گی، مجھے ضروری ڈائیکرام بنانی ہے۔“

تھوڑی پس و پیش کے بعد اینڈنٹ نے اس کا نام رجسٹر پر لکھ کر ایڈیٹور کی اور اسی دن اچانک ہی دو تین دن کی چھٹی اناؤنس ہوئی۔ دوویک اینڈ کی مل گئیں۔ سب بچوں نے گھر جانے کا پرگرام بنالیا تھا، نجستہ بھی گھر آگئی تھی۔ اس کے گھر آنے پر عید کا سماں ہوتا تھا۔ وہی گھر والے جو اس کے شہر جا کر پڑھنے پر پریشان تھے۔ اب سارے ملنے ملانے والوں کو فخر سے بتاتے تھے۔

”مڑے (ارے) نجستہ ڈاکٹر بن رہی ہے۔“

یہاں تک کہ کئی اڑوں پڑوس کی ملنے بھی آجاتی تھیں اور ہر دوسری اسے اپنی بیماری ایسے تفصیل سے بتا کر علاج پوچھتی جیسے وہ سچ سچ اسپشلسٹ بن چکی ہے۔ اور خانی بیگم فخر سے سراٹھالیتیں، جیسے وہ ابھی دوا لکھ دے گی اور سامنے والی کو آرام آجائے گا۔ اب ان سادہ لوگوں کو کیسے سمجھائے ابھی تو صرف جسم کا نظام پڑھ رہی ہے۔ علاج تو آخری سال میں پڑھایا جاتا ہے۔ وہ ٹالنے کے لیے مسکرا کر قیاس لگاتی۔ اسی قیاس کو سننے کے لیے کوئی نہ کوئی آئی رہتی تھی۔

اس شام بھی وہ اپنی چیزیں لیے درتچے کے ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے اس کے ایک کتاب کھلی تھی۔ ہاتھ میں بون پکڑے اس پروین (رگوں) کی ڈائیکرام سمجھ رہی تھی۔ جب پہلی بار داجی نے اس کے پاس انسانی ہڈی دیکھی۔ وہ ہنسے تھے، امروز لالہ کی ہنسی میں کراہیت تھی لیکن زربخت تو اچھل کر اس کے بیک سے پیچھے ہوئی۔

”یہ تم گھر کیوں لے آئی ہو۔ تمہیں ڈر نہیں لگتا مردے کی ہڈی سے۔“

وہ زور سے ہنسی تھی۔

”اس میں ڈرنے کی کیا بات، جیسی ہمارے جسم میں ہے، ویسی تو ہے یہ، اپنے جسم سے ڈرتے ہیں کوئی۔“

”مردہ اور زندہ میں فرق ہوتا ہے۔“ زربخت نے اس کا بیگ بالکل ویسے اٹھا کر کمرے سے باہر رکھا تھا جیسے وہ اس کا اوور آل اٹھا کر نلکے کے پاس دھونے کے لیے رکھتی تھی۔ اسے جب سے پتا چلا تھا یہ پہن کر نجستہ مردوں کی کاٹ پیٹ کرتی ہے اس نے لمبی سی چھڑی سے اوور آل اٹھایا۔ تسلے میں ڈال کر فٹائل والے پانی میں بھگوایا تھا اور بون کو تو دیکھتے ہی اچھی خاصی جھر جھری آ جاتی تھی۔

”نجستہ دفنا دو اس غریب کو، ثواب ملے گا۔“

”جب اسے سینکڑوں بچے پڑھ کر لاکھوں کا علاج کریں گے، ساری انسانیت کو ثواب ملے گا۔ اور خدا کے واسطے، ثواب کے چکر میں تم اسے دفنانہ دینا، کالج والے مجھے نکال باہر کریں گے، بہت مشکل سے ملتی ہیں یہ۔“

دفنانا تو ایک طرف زربخت قریب سے نہ گزرے، تب بھی وہ اسے بلانے آئی، ہڈی ہاتھ میں دیکھ کر دور سے ہی پکاری تھی۔

”نجستہ! دریا خان کی بہو آئی ہے تم سے ملنے، مورے (ماں) کے کمرے میں بیٹھی ہے مل لو۔ بلائی ہے۔“

اسے پتا تھا وہ بیماریوں کی لمبی چوڑی فہرست لائی ہوگی۔ اگر نہ گئی تو ناراض۔ بون کتاب پر رکھ کر وہ خانی بیگم کے کمرے میں گئی تھی۔ اس کے اندازے کے مطابق دریا خان کی بہو اسے دیکھتے ہی شروع ہو گئی، اس کی بات تو اس نے جانے سنی تھی بھی یا نہیں اس کی نگاہ کھڑکی سے دکھائی دیتے درخزئی پر گئی جو بون اٹھا کر معائنہ کر رہا تھا، وہ فوراً باہر کی جانب لپکی۔

جس چیز کا درخزئی کو پتا چل جاتا کہ نجستہ کے بہت کام کی ہے، یا بہت مشکل سے ملتی ہے اسے توڑ پھوڑ کر بہت سکون ملتا تھا اسے، وہ ابھی تک بھولی نہیں تھی، جب اس نے اپنی ہسٹو پنسل (وہ پنسل جو صرف میڈیکل میں ہڈیوں پر ڈائیگرام بنانے میں استعمال ہوتی ہے) کا بتایا۔

”لالہ! یہ معمولی سی پنسل دو سو کی ملتی ہے، ہم بہت احتیاط سے استعمال کرتے ہیں اسے۔“

درخزئی نے موقع پاتے ہی ساری تراش کر پھینک دی۔ اس سے پہلے کے وہ ہڈی کے ساتھ بھی کچھ ایسا دیا کرتا وہ تیزی سے بڑھی۔

”یہ ادھر دے دو۔“

درخزئی نے کڑوی تیوری چڑھائی۔

”یہ گھر ہے قبرستان نہیں، جہاں مردے لانے لگی ہو۔“

وہ کہہ کر باہر کی جانب بڑھا۔ وہ پیچھے پیچھے مانگتی ہوئی میکا کی انداز میں اس پر جھپٹی مگر اس نے دروازہ کھولتے ہی بہت دورندی میں اچھال دی۔ خستہ کی سانسیں رکیں، منہ وا ہو گیا۔

”یہ۔ یہ کیا کیا تم نے درخزئی۔ کتنی مہنگی تھی وہ، جانتے بھی ہو کالج والے کیا کریں گے اب میرے ساتھ۔“
اس کی بے بسی پر درخزئی نے ٹھٹھا مارنا چاہا تھا مگر پانی سے بھری سبز آنکھیں قہقہے میں پھٹے منہ کو اکڑا گئیں، سبز پہاڑوں کو پہلی بار سیلاب میں بہتے دیکھا تھا، اس کے دل کو ایک دھکا سا لگا تھا، کہا تو اس نے کچھ نہیں، اپنا سر جھٹک کر وہاں سے ہٹ گیا۔ ہاں ایک ملامت سی محسوس ہوئی تھی جسے وہ ظاہر ہونے دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے دل کا حال کیا بتاتا۔ اسے کس بات کا ڈر ہے۔ اگر وہ سچ مچ ڈاکٹر بن ہی گئی تو کیا پلٹ کر آئے گی، کبھی نہیں اور اپنی بچپن کی منگیتر خستہ کو وہ کھودے ناممکن۔



خانی بیگم کو بھی اس کے پلٹنے کی فکر تھی۔ حاجی بھی بنیادوں کا درس دیتے، زربخت ایک ہی بات کرتی۔

”امروز خان نے تمہاری ضمانت دی ہے، پڑھ لکھ کر اس کے سر پر خاک نہ ڈلوانا۔“

امروز لالہ کی خاموش نگاہیں اسے التجائیہ لگتی تھیں اور جس کی خاطر اسے سب واپس لانا چاہتے تھے اس کی ہٹ دھرمی۔ اسے اپنی قسمت پر رونا آیا تھا اور اس دن وہ روئی بھی بہت، جب انٹینڈنٹ نے بون واپس مانگی اس سے کوئی جواب بن نہیں پایا۔ اطہر کو جیسے ہی اندازہ ہوا خستہ بون لے گئی تھی اور واپس نہیں دے رہی اس نے انٹینڈنٹ سے بار بار مانگنی شروع کر دی۔

”مجھے پڑھنی ہے، لیں اس سے، مجھے ضرورت ہے۔“

ہادی کو جی آر بریرہ نے بتایا کہ کوئی حل ڈھونڈے تب اس نے انٹینڈنٹ سے بات بنائی۔

”سوری سر، وہ تو مس خستہ سے میں نے لے لی تھی۔“

خستہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ پورے اعتماد کے ساتھ جھوٹ بول کر انٹینڈنٹ کو مطمئن کر چکا تھا۔ پڑھ

کردو چار دن میں لوٹا دے گا، بھلے بعد میں اس نے جختہ کو لا پرواہی پر اطہر کو ڈھٹائی پر ڈپٹا تھا۔

”شرم کرو، تمہاری کلاس فیلو ہے، حادثہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔“

اور انٹینڈنٹ کو جانے کیسے فائن دے کر چپ کروایا مگر جختہ کو پوری کلاس اور ٹیچرز میں سبکی ہونے سے بچالیا تھا اور ایسے کتنے کام اس نے کیے تھے، پھر بیج تبدیل کروانا تو ایسا کوئی بڑا کام بھی نہیں تھا۔ صرف ہادی نے اتنا ضرور پوچھا تھا۔

”کیوں؟“

وہ چپ رہی۔ ہادی نے ساری یونٹ لسٹ چیک کی تقریباً اس میں ساری اس کی فرینڈز ہی تھیں۔ اطہر کے نام پر اس کی ابھی پیشانی یک دم سیدھی ہوئی، سکڑے ہونٹ کھلے، اس نے اپنی سینک اتار کر شیشے صاف کرتے عام سے لہجے میں پوچھا تھا۔

”اطہر Irritate (تنگ کرنا) کرتا ہے آپ کو۔“

وہ چپ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ سینک پھر سے جماتے دھیماسا بولا۔

”اکیچولی گھر میں سب سے چھوٹا ہے، کچھ لاڈلا بھی۔ بہر حال میں سمجھاؤں گا اسے۔ اور یونٹ کا کوئی ایٹو نہیں ڈونٹ وری چینج ہو جائے گا۔“

وہ کہہ کر جا چکا تھا پشت سے اس کی ہموار چال کو دیکھتے جختہ نے لہجہ بھر سوچا تھا۔

”کتنے اچھے ہو تم ہادی لیکن.....“ اس نے خود کو فوراً سرزنش کی۔

”تم اس کی اچھائی کیوں سوچ رہی ہو جختہ؟“



یونٹ تبدیل ہونے میں زیادہ دن نہیں لگے تھے، بہت آرام سے ہوئے اور کام معمول پر ہوتا رہا تھا۔ وہ بھی ایک عام سادہ دن تھا۔ کلینیکل شروع ہوتے ہی آپسی ڈیڈ باڈی کے بجائے مریضوں پر ہونے لگی تھی۔ آپسی کے سلسلے میں معلومات اکٹھی کرنے وہ اسٹاف روم میں کچھ مریضوں کی فائل لیے بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر ہادی نائٹ ڈیوٹی کے بعد ہاسٹل کے لیے نکل رہا تھا۔ اسے وہاں بیٹھا دیکھ کر کینٹین گیا، چائے کے دو کپ لیے اس کے پاس آ

بیٹھا۔ اپنی جانب بڑھتا کپ دیکھ کر وہ اپنی چادر درست کرتے مسکرائی۔

”ٹوہینکس۔ میں بریک فاسٹ کر چکی ہوں۔“

”لیکن یہ تو ڈاکٹر زکا ایندھن ہے۔ پکڑیں۔“

شکر یہ میں سرخم کرتے اس نے کپ پکڑا اور چسکیاں بھرنے لگی۔

”کیا دیکھ رہی تھیں آپ؟“

”آج آپسی ہے، کل فارماکوا (واپوا)، میں نے سوچا پیڈنٹ فائلز چیک کر لوں۔“

ہادی کو جتنی معلومات تھیں وہ اس بارے میں دیتا رہا، پھر کچھ دیر بعد عام سے انداز میں پوچھا تھا۔

”آپ کا فائل ایئر کمپلیٹ ہو رہا ہے۔ اس کے بعد کیا راہ ہے؟“

لحمہ بھر کو جختہ کے چہرے پر سکون کی چمک تھی۔

”ہاؤس جاب۔“

”وہ تو یقیناً۔ میرا مطلب ہے آپ کی پرسنٹ ایجنسی پر پلیم آفر ہے۔ تو؟“

(پلیم، امریکن میڈیکل اسپیشلائزیشن اسکالرشپ) اس کی آنکھیں پھکی سی ہوئیں اور نفی میں سر ہلایا تھا۔

”وائے۔ یہ تو آپ کا کریڈٹ ہے، اس سال صرف چار بچے اناوائس ہوئے ہیں جن میں آپ شامل ہیں،

اتنی بڑی اپروچیونٹی آپ چھوڑ دیں گی۔“

پلیم کے لیے بچے سردھڑکی بازی لگنے کو تیار رہتے ہیں جن کے ہاتھ پڑتی ہوں وہ سفارش تک اور جسے

تھالی میں رکھ کر پیش کیا جا رہا ہو وہ سرد تاثر کے ساتھ چپ تھی۔ اب کیسے بتاتی اس کی فیملی نے یہاں تک جانے

کیسے پہنچا دیا۔ امریکہ اس کا خرچہ کیا، اس کے سارے خاندان کا خرچہ بھی اٹھانے کا کہے، تب بھی کوئی جانے نہ

دے۔

”انسان اپنے خواب خاندان سے بہت اونچے رکھے بھی کیوں۔“ ہادی نے بھی زیادہ نہیں کریدا، لہجوں کی

خاموشی کے بعد آہستگی سے پوچھا تھا۔

”ایک بات کرنا چاہتا ہوں آپ سے؟“

اس نے گردن اس کی جانب گھماتے سوالیہ نگاہ اٹھائی تھی، ہادی پل بھر سبز آنکھوں کا سحر برداشت کر سکا، پھر سامنے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”آپ کسی سے کمیڈ ہیں؟“

سبز آنکھیں تحیر سے پوری کھل گئیں۔ وہ فوراً سنبھلا۔

”میرا مطلب ہے کہ۔“ اس نے اپنا چوڑی کمائی کا چشمہ اتار کر صاف کیا، بات کرتے اسے کچھ الجھن ہوئی تھی لیکن آج وہ کر لینا چاہتا تھا۔

”میری ہاؤس جاب کمپیٹ ہو رہی ہے اور ہر ماں باپ کی طرح میرے والدین بھی چاہتے ہیں میری شادی کر دی جائے۔ ہماری ایجوکیشن تو تاحیات چلنے والی ہے، اسپیشلائزیشن پریکٹس کے ساتھ ہوتی رہے گی اور میری خواہش یہ ہے، میری زندگی کا سفر آپ کے ساتھ گزرے۔ تو.....“

”تو۔“ کے بعد اس کے معنی خیز دیکھنے کو وہ نہ سمجھے اب ایسا بھی نہیں تھا، لیکن اتنی جدید تعلیم حاصل کر لینے کے بعد بھی خجستہ کے اندر کی پہاڑی لڑکی مری نہیں تھی، آن واحد میں اس کے سپید گالوں پر سرخی لہرائی، گھنی پلکیں لرز کر اٹھیں۔ وہ خالی کپ سیٹ پر رکھتے ہوئے کہہ گئی۔

”ایم آل ریڈی انگلیجڈ۔“

ہادی کے لیے یہ بہت بڑا جھٹکا تھا۔ تقریباً اس کی ساری فیملی کو جان گیا تھا۔ لینے چھوڑنے کے دوران ان پانچ سالوں میں امر و زلالہ سے بات چیت بھی ہوئی تھی۔ باقی سب کا ذکر بھی کئی بار کیا مگر مگیتز کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ اس نے بھنڈوں اچکا کر اسے جاتے مایوسی سے دیکھا تھا۔ کوریڈور کی جانب بڑھتے قدم خجستہ کو خود بھی تھکے تھکے لگے، جیسے اپنے کہے پر اسے خود بھی یقین نہ ہو، عین اسی لمحے اطہر ادھر سے گزرا تھا۔ یقیناً پوری بات اس نے نہیں سنی ہوگی، صرف آخری جملے سے ہی اندازہ لگا لیا کچھ آج کل اس کے دوست بھی کہہ رہے تھے۔

”تمہارا بھائی اور ڈاکٹر خجستہ آج کل بہت ساتھ ساتھ دکھائی دے رہے ہیں۔“

وہ ہادی کے قریب آنے کے بجائے تیز قدموں سے خجستہ کی جانب بڑھا۔ وہ کوریڈور کے آخری سرے پر تھی۔

”ایکسکیوزمی۔“

اس نے گردن پھرتے ہوئے استفہامیہ منہ نہیں اٹھائیں۔

”کچھ عرصہ پہلے آپ کا یونٹ اچانک سے تبدیل ہوا تھا، جاننا یہ ہے وہ ہادی نے تبدیل کروایا تھا یا ہادی کے لیے تبدیل کروایا گیا تھا۔“

”آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔“ وہ سختی سے بولی تھی۔

”سیمپل۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ ”اس یونٹ میں آخر مسئلہ کیا تھا؟“

”آپ۔“ اس کے ٹھوس انداز پر اطہر کی آنکھیں پھیل کر بھنچی۔

”آپ مسئلہ تھے، میں آپ کے ساتھ پر اپر کام نہ کر پاتی۔“

اطہر کے تو سارے بدن میں گرم لہر دوڑ گئی، چبا چبا کر بولا تھا۔

”آپ نے سمجھ کیا رکھا ہے مجھ کو، تھرڈ کلاس، آوارہ، نکلا۔ میں اچھے اچھوں کو منہ نہیں لگاتا اور آپ کی اوقات ہی کیا ہے۔“ اس نے گردن میں جھولتا اسٹینڈیو اسکوپ کھینچ کر اتارا اور اوور آل کی پاکٹ میں اڑسا۔ ”اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بدلنے کے لیے میرے بھائی کو سیڑھی مت بنائیں، وہ بہت رحم دل ہے، بھولی صورتوں پر ترس آ جاتا ہے، اس کے ترس کو محبت مت سمجھئے گا۔ رائٹ۔“

بخستہ نے سر سے پاؤں تک اسے ایک نظر دیکھا، استہزا میں ہنسی۔

”اور کچھ کہیں گے آپ؟“

”کہہ ہی نہیں، میں بہت کچھ کر بھی سکتا ہوں۔“

”شوق سے۔“ وہ کہہ کر تیز قدموں سے ایک وارڈ میں داخل ہو گئی تھی۔ پیچھے وہ تلملا کر رہ گیا۔



اطہر کے جملے اتنے محسوس نہیں ہوئے تھے جتنا ہادی کا دھیمبا لہجہ اس پر کارگر ثابت ہوا، کتنے دن وہ شعوری کوشش سے ہادی سے کتراتا رہی مگر اندر کچھ کھٹک رہا تھا۔ چاہتے ہوئے بھی اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پاتی تھی۔ اس دن وہ ہاسپٹل کے گراؤنڈ میں بیچ پر کچھ پڑھنے کے لیے بیٹھی تھی لیکن ذہن بے طرح منتشر ہو رہا تھا۔

تب ہی وہاں ہادی بھی آ بیٹھا، وہ اس کے بیٹھنے پر چونکی ضرور مگر غاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ بیچ پر آگے کو ہو کر بیٹھا کچھ دیر بعد آہستگی سے بولا تھا۔

”مس خجستہ! غالباً آپ نے بتایا تھا آپ کے تایا کے دو بیٹے ہیں، ایک تو آپ کے بہنوئی ہیں امروز لالہ، دوسرے۔“ وہ رک کر ذومعنی سا اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ”کیا وہ آپ کے.....؟“

خجستہ نے آنکھیں سختی سے بند کیں، اثبات میں سر ہلایا۔ ہادی کے ماتھے کی ناگواری لہجے میں درآئی۔ سال پہلے اسپورٹس گالا پر اس نے درخزئی کو تب دیکھا تھا جب وہ خجستہ کو گھر لے جانے آیا تھا، اس کی چال ڈھال، دیکھنے، بولنے کا انداز ہادی کو بہت عجیب لگا تھا۔ خاص کر جب اس نے اسٹال پر کھڑی لڑکیوں کو اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ بے فکری سے باتیں کرتے دیکھ کر نخوت سے ناک چڑھائی۔

”ماں باپ سمجھتے ہیں ڈاکٹر بن رہی ہے۔ ادھر تو یاریاں چل رہی ہیں۔“

ہادی کا جی چاہا تھا اس کا منہ توڑ دے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا چادر میں لپٹی خجستہ اپنی چیزیں اٹھائے اس کے پاس آکھڑی ہوئی، پھر پتا چلا تھا یہ اس کا کزن ہے۔ اس کے پیچھے چلتی خجستہ کو دیکھ کر وہ تاسفانہ سوچتا رہ گیا۔

”سچ کہتے ہیں گڈڑیوں میں بھی لعل ہوتے ہیں۔“

اس وقت خجستہ کا اقرار میں ہلتا سرا سے تپا گیا۔

”کیا آپ سمجھتی ہیں، یہ ایک پرفیکٹ میچ ہے؟“

”ہمارے میچ ہمارے بزرگ بناتے ہیں۔ وہ جو سمجھتے ہیں انہیں پرفیکٹ لگتا ہے۔“

”لازمی تو نہیں بزرگ ہر بار پرفیکٹ ہوں، انہیں کیسے سمجھایا جاسکتا ہے، قائل کیا جاسکتا ہے۔ آپ پڑھی لکھی ہیں خجستہ، وہ کسی صورت بھی آپ کے قابل نہیں۔“

”ہمارے ہاں قابلیت کا معیار روایات ہیں۔ اور پلیز۔“

وہ مزید بات نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن ہادی آج بہت کچھ کہنے بیٹھا تھا۔

”آپ ایک ڈاکٹر ہیں، جو اپنے ساتھ سنسیر نہیں، وہ اس پیشے کے ساتھ کیسے سنسیر ٹی دیکھا جاسکتا ہے۔“

اس نے اپنے لہجے کی نمی کو قابو کرتے اٹل انداز میں کہا تھا۔

”ڈاکٹر ہادی ہم کوئی اور بات کر سکتے ہیں۔“

”بالکل کر سکتے ہیں نجستہ، لیکن کیا کروں اس دل کا جو ہنا سوچے سمجھے، آپ سے بہت محبت کرنے لگا ہے اور آپ کو یوں ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ پلیز پلیز اپنے ساتھ اتنا ظلم مت کریں۔ وہ شخص آپ کے معیار کا ہرگز نہیں۔“

نجستہ نے اسے میکانیکی انداز سے دیکھا۔

”پلیز سوچئے گا ضرور۔“

وہ کہہ کر چلا گیا تھا مگر اس کے دل کی دھڑکن بے حد بے ترتیب ہو چکی تھی۔



ہادی نے ہاؤس جاب مکمل ہوتے ہی اپنے حلف کے مطابق گورنمنٹ جاب کے لیے اسی ہاسپٹل کو ترجیح دی تھی۔ نجستہ کی بھی ہاؤس جاب شروع ہو چکی تھی، جیسے ہی اس کے گھر والوں کو پتا چلا تھا، اس کا کورس پورا ہونے میں کچھ ہی وقت رہ گیا خانی بیگم نے شادی کی تیاریاں تیز کر دی تھیں اور حاجی نے جمال خان کے حصے کی زمین پر کلینک بنوانے کا کہا، درخزئی جو گھر کی مرمتوں اور پتھر کے فرش ڈلوانے میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ کلینک کی تعمیر پر ماتھانا گوار بلوں سے بھر گیا۔

”کیا مطلب ہے، شادی کے بعد بھی وہ باہر رہے گی۔ رہنے دیں حاجی، کچھ سالوں بعد دیکھیں گے یہ سب۔ پہلے گھر بار دیکھے، بچے پالے۔ یہ بعد میں ہو جائے گا۔“

امروز کو اس کی بات پر غصہ تو بہت آیا تھا کہ شادی ابھی ہوئی نہیں اس جاہل کو بچوں کے خواب آنے لگے مگر حاجی کی وجہ سے اپنا لہجہ قدرے نارمل رکھتے کہا تھا۔

”سب کام ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں، وہ پڑھی لکھی ہے، سنبھال لے گی۔“

چادر کی بکلی مارتے وہ وہاں سے اٹھا۔

”لیکن شادی کے بعد میری مرضی۔“

اس کے لفظ بیچ میں رہ گئے تھے، ہاتھ روم سے صفورا بیگم کی خطرناک چیخ آئی تھی۔ ہاتھ روم میں سادہ فرش

توڑ کر پتھر کی ٹائلیں لگوائی گئی تھیں، صفورا کا پاؤں پھسلا۔ دونوں بیٹے بہت مشکل سے بھاری بھر کم ماں کو اٹھا کر باہر چار پائی تک لائے، ان کے کراہنے میں کسی صورت کمی نہیں آرہی تھی۔ خدشہ تھا گھٹنے کی ہڈی ٹوٹی ہے۔ امروز خان جراح کو گھر لے آیا جو عورت ٹوپی والا برقع لے کر گھر سے نکلتی ہو وہ چار پائی پر جراح کے سامنے لیٹی تھی۔ اس نے پہلے اس کی ٹانگ کو ڈھکے ڈھکے ہی جانچا پھر ”گھٹنا ٹوٹ گیا ہے“ کہہ کر کچھ پھٹیاں، پٹیاں اپنے سامان سے نکالنے لگا۔ جب اس نے بوڑھی صفورا کی شلوار کا پائینچہ اوپر کو سرکایا، درخزئی کا چہرہ ایک لخت تپ گیا۔ اس نے آنکھیں سختی سے بھینچیں اور وہاں سے ہٹ گیا۔ جتنی ماں کو تکلیف تھی اسے ٹوٹی ٹانگ کے ساتھ چھوڑا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ کسی مرد کے سامنے اپنی ماں کا برہنہ حصہ دیکھنا بھی مشکل تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار احساس ہوا عورتوں کے علاج کے لیے عورت معالج کا ہونا بھی ضروری ہے۔

صفورا چار پائی سے لگ گئی تھی۔ جراح روز دیکھنے آتا تھا۔ خجستہ کو پتا چلا اس نے چھٹتے ہی کہا تھا۔
 ”کیا مطلب ہے؟ آپ لوگوں نے ایسے ہی ان کی ٹانگ بندھوا دی۔ ان کا ایکسرے کرواتے، پھر پتا چلتا۔ آپ انہیں فوراً یہاں لے آئیں۔“
 ایکسرے کا سن کر درخزئی کے کان مزید تپ گئے، یعنی اب تصویر بھی مرد سے اتروائیں اور جانے کیا کیا ہوگا کیونکہ ایک مہینہ ہو گیا تھا جراح کے علاج کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا، اس نے خجستہ کو فون پر کہا تھا۔
 ”کیا تم نہیں یہ سب کر سکتا۔ مطلب مورے (ماں) کی مرہم پٹی، تم بھی تو کب سے ڈاکٹر بن رہا ہے۔“
 وہ پھسکی سی ہنسی تھی۔

”پہلی بات تو یہ، میں صرف ابھی ایم بی بی ایس ہوں اسپیشلسٹ نہیں، دوسری بات ایکسرے کرنے کی پڑھائی شروع سے الگ ہے، وہ وہی کرتے ہیں جنہوں نے پڑھا ہو۔“
 ”یعنی کہ مرد۔“

”نہیں، اب لڑکیاں بھی اس شعبے میں ہیں۔ شکر ہے کچھ لوگ ہیں، جنہیں اب سمجھ آنے لگی ہے، عورت کی ضرورت کس کس شعبہ زندگی میں ہے۔ خیر تم چاچی کو یہاں لے آؤ۔ ہو جائے گا۔“
 صفورا کا علاج وہاں بہت اچھا ہوا تھا، کچھ مہینے پلاسٹر چڑھا۔ پھر پہلے کی طرح چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی

تھیں۔ اس سب سے درخزئی میں یہ تبدیلی آئی تھی، اس نے جمال چاچا کی زمین کا ساتھ اپنے حصے میں آنے والی زمین بھی ہسپتال کی تعمیر میں شامل کروائی۔ اس کی نگرانی میں مزدور مستری تیزی سے کام کر رہے تھے۔



آنکھوں کے کناروں پر تیرتا اس کا بچپن کا خواب جیسے جیسے تکمیل کی جانب بڑھ رہا تھا، اسے بے پناہ خوش ہونا چاہیے تھا لیکن انجانا سادل چاہتا تھا یہ کبھی مکمل ہی نہ ہو، دن میں کئی بار خود کو جھٹلاتی کہ وہ خوش ہے اور ہر بار جھٹلانے کے بعد اس کی تھکن سوا ہو جاتی۔ پانچوں سالوں میں ڈسٹنکشن (امتیازی گولڈ میڈل) لینے والی نجستہ کو مشکل ترین پڑھائی نہیں تھکا سکی تھی، جتنا آنے والے لمحوں کی سوچ نے تھکا دیا تھا۔ جس دن ڈاکٹر ہادی نے کہا تھا۔

”ڈاکٹر نجستہ! میرا لندن اسپتال نرسن کا اسکا لرشپ آگیا ہے، اور میری شدت سے خواہش ہے، میرا داپسی کا انٹرسٹ آپ ہی رہیں۔“

”کب جارہے ہیں آپ؟“

اس کے یکسر الگ سوال پر وہ پھیکا سا ہنسا۔

”چھ سات ماہ لگ جائیں گے اپرول میں۔ لیکن یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔“

”ڈاکٹر ہادی! ہماری زندگیوں میں بہت سی باتوں کے جواب نہیں ہوتے۔“

وہ اٹھ کر جانے لگی۔ وہ بولتے ہوئے ساتھ اٹھا تھا۔

”لیکن مجھے اس بات کا چاہیے۔ پلیز روایات کی بھینٹ اپنا فیوچر مت چڑھائیں۔ میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔“

اس کے چند جملے لاشعوری طور پر درخزئی اور ہادی کا موازنہ کرنے پر اکساتے، ان کی چال ڈھال، اخلاق، انداز، سوچ اور مستقبل۔ ہادی ہر بار آگے آکھڑا ہوتا، وہ سختی سے آنکھیں بند کر کے خود کو باور کرواتا تھی۔

”نہیں، میں کیوں کسی کو سوچنے لگی۔“

اپنے اندر چھڑی جنگ کا اندازہ اسے اس دن ہوا جب وہ عصر کی نماز پڑھ کر دعا مانگنے لگی ہی تھی کہ امروز لالہ

کافون آگیا۔ جائے نماز پر بیٹھے ہوئے اس نے فون اٹھایا۔

صفورا چاچی کی خیر خیریت پوچھ لینے کے بعد معمول کی باتیں کرتے امروز خان نے کہا تھا۔

”تم بتا رہی تھیں تمہارا کورس پورا ہونے والا ہے، پھر کب لینے آؤں تمہیں؟“

”ایسی بھی کیا جلدی ہے لالہ، جب پورا ہوگا بتا دوں گی۔“

اس کے جواب میں وہ آرام سے بولے تھے۔ ”مجھے نہیں درخیزی کو جلدی ہے شادی کی، سب تیاری ہوگئی

ہے بس تمہارا انتظار ہے۔“

سننے ہی اس کے تن بدن کی گرمی لہجے میں اٹدی۔

”اسے کب جلدی نہیں تھی لالہ۔ اس کی جلدی کی خاطر میں اپنی تعلیم تو داؤ پر نہیں لگا سکتی ناں۔“

یک لخت اس کے فون بند کر دینے پر جہاں امروز خان بری طرح چوکے تھے وہاں وہ خود اس سے زیادہ
چوکی اور پھر اپنے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے زور زور سے روئی تھی۔

”کاش میں بھی زربخت جیسی ہوتی، ہر فیصلہ اپنی قسمت سمجھ کر شاکر رہتی۔ میرے اللہ مجھے اپنی تقدیر کو خوشی
خوشی قبول کرنے کی طاقت دے دے۔ ایک طرف میرا مستقبل ہے، ایک طرف میری روایات، میں نہیں چاہتی
ان دونوں کے بیچ سزاوار میری تعلیم بن جائے۔“

آن واحد میں اس کی نگاہوں کے سامنے زمینوں پر کام کرتے گل ریز چاچا کے میلے کچلے بچے گھوم گئے، اس
کا سر ٹرانس کی صورت نفی میں ہلاتھا۔ زربخت کی دو پیاری پیاری بیٹیاں اسے اپنے گرد کھڑی نظر آئیں۔ ترسی
نگاہوں میں سوال لیے۔

”مڑے اتم ہمیں اونچائی دکھانے کے لیے اینٹیں رکھ رہی تھیں، ان اینٹوں سے دیوار کیوں بنا گئیں۔“
نارنجی پھانک جیسے لب آپس میں پوست ہوئے ناک کی نمی، سڑکتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں ہتھیلی کی
پشت سے رگڑ ڈالیں۔

”بخستہ تو ان کے لیے رستہ بنانے لگی تھی اور دیوار بنانے میں لگ گئی، یہ سکھایا تعلیم نے تجھے؟“

پانی پی کر اپنے بھرائے لہجے کو قابو کرتے اس نے امروز خان کو کال ملائی۔

”جی لالہ، سگنل کٹ کئے تھے۔ میں نے آپ کو بتانا تھا کورس تو پورا ہونے والا ہے لیکن کچھ ٹائم لگ جائے گا، مجھے اپنی کلیئرنس کروانی ہے، پھر اگلے مہینے کا نوو کیشن ہے اس میں اسناد اور میڈلز ملنے ہیں، بس یہی دو تین ماہ ہیں، پھر میں آ جاؤں گی۔“



وہ اپنے دل کو مکمل طور پر سمجھا چکی تھی اور اس پر کاربند رہنے کے لیے ڈاکٹر ہادی سے جان کر گریز کرتی رہی۔ یہ اس رات کی بات ہے جب نائٹ ڈیوٹی دینے کے بعد دو گھنٹے کے لیے ملنے والے آرام کے بریک میں وہ شاف روم میں رکھے لکڑی کے سخت بیچ پر لیٹی تھی۔ اس کی آنکھ لگے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر بریرہ کے رونے کی آواز پر وہ ہڑبڑا کر اٹھی، اسی وقت روم میں کئی سینئر ڈاکٹر ز بھی اس کے ساتھ داخل ہوئے تھے جن میں ڈاکٹر ہادی بھی شامل تھا۔ سنیر ڈاکٹر بریرہ کو سمجھا رہے تھے۔

”ڈاکٹر بریرہ! اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہمارا کلچر ہی ایسا ہے پہلے تو گھر والے خود ڈاکٹر بننے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں، جب بات ہاتھ سے نکل جائے تو پیسٹ ڈاکٹر کے سر لگانے لے آتے ہیں۔“

”سروہ مرگیا، اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اس کی بیوی ہمیں بددعائیں دے رہی تھی کہ ہمیں اپنی فیس سے غرض ہے، ہماری لاپرواہی سے اس کے میاں کی ڈیڑھ تھہ ہوئی۔“

ڈاکٹر مریم اور ڈاکٹر ردا جو پہلے ہی ڈاکٹر بریرہ کے رونے پر پریشان سی تھیں، روہانسی لہجے میں بریرہ کے رونے کی وضاحت دینے لگیں۔ اچھا اوڈی تاسف سے ہنکارہ بھرتے آگے بڑھے۔

”ڈاکٹر صرف وسیلہ ہے اور وسیلوں کی سلامتی کی دعا کرنی چاہیے لیکن نادان لوگ ہمیں خدا سمجھ لیتے ہیں۔ کیا دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں کہیں نقصان نہیں ہوتا، انسان کی بنائی ہوئی مشین کو ٹھیک کرنے میں انسان غلطی کر جاتا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی مشین کس قدر پیچیدہ اور ہر ایک دوسری سے بے حد مختلف، کیا یہاں انسان سے غلطی نہیں ہو سکتی۔ دل کے مریض کو پمپ کرنے میں مریض کی چند ٹوٹی پسلیاں لوگوں کو دکھائی دے جاتی ہیں، جو زور لگانے میں ڈاکٹر ز کے کندھے اتر جاتے ہیں وہ دکھائی نہیں دیتے، کیونکہ واویلہ کرنے والے ہمارے بیوی بچے پاس نہیں ہوتے۔ ہزاروں مریضوں میں گنتی کی چند ڈیڑھ ہمارے فیسوں اور کوتاہی لگتی ہے، جو ہزاروں صحت یاب

ہو کر گھروں کو جاتے ہیں، ہمارے ہاتھوں میں جو روزِ جنم پاتے ہیں، تب ہماری نیند سے خالی آنکھیں دکھائی نہیں دیتیں۔ ڈاکٹرز کے ہاتھ، دماغ آنکھیں دنیا کے قیمتی ترین ہاتھ، دماغ، آنکھیں ہیں، جو اللہ کی بنائی مخلوق کی بہتری میں بہر حال مصروف ضرور ہیں۔ چلیں شاباش منہ ہاتھ دھوئیں اور چائے پیئیں۔ ہمارے لیے یہ اعزاز بہت ہے لوگ بے شک ہمیں گالیاں دیں لیکن اپنے دکھ تکلیف میں آتے ہمارے پاس ہی ہیں اور ان کے دکھ سننے کے لیے اللہ نے ہمیں چنا ہے، ہمارا عہد ہے، انہیں ٹھیک کرنے کی ہم پوری کوشش بھی کریں گے تا حیات۔“

باقی ڈاکٹر اس کے شانے تھپکتے ایک ایک کر کے چلے گئے مگر ڈاکٹر ہادی وہاں ہی تھے، اس نے کن آنکھیوں سے بخستہ کی نیند سے تھکی تھکی گلابی آنکھیں دیکھ کر کہا۔

”چلیں، آئیں میں آپ کو چائے پلاتا ہوں۔“

”نہیں۔ بخستہ تو اٹھارہ گھنٹے بعد اب سوئی تھی، میری وجہ سے اٹھ گئی۔ سو جائیں بخستہ۔“ بریرہ شرمندہ ہوئی۔

اس نے اپنی پوری آنکھوں پر رکھتے ہوئے دبائیں۔

”نہیں اب نیند نہیں آئے گی۔“ اور قریب رکھی عینک اٹھا کر لگالی۔

ہادی فوراً بولا۔ ”چائے یہاں ہی منگوا لیتے ہیں۔“

پیون کے چائے لاتے ہی مریم کو یاد آیا تھا۔

”مجھے تو وارڈ کار اوٹ لگانا ہے۔“

تب ہی بریرہ اور ردانے گرم گرم چائے حلق میں اٹھیلی۔

”ہاں یار، ہماری ایمر جنسی میں ڈیوٹی ہے۔“

”لوگ ایک مریض کے ساتھ صرف ایک رات جاگ کر ظاہر کرتے ہیں، وہ تھک گئے، وہ پریشان ہیں، حالانکہ وہ ان کے اپنے ہوتے ہیں اور ہم ہر روز ایسے ہی تمام مریضوں کے ساتھ سوتے، جاگتے میں رات کاٹتے ہیں لیکن ہماری کوئی قدر نہیں۔ لوگ ہمیں فیس دے کر روٹ سمجھ لیتے ہیں۔“

ڈاکٹر ہادی کے متاسف لہجے پر بخستہ مسکرا دی۔

”کیا کہا جاسکتا ہے، ہم نے اپنی مرضی اور خواہش سے یہ شعبہ چنا ہے۔“

”بالکل۔ لیکن کچھ قدر تو ہونی چاہیے۔ چلیں کوئی نہ کرے مگر ہمیں خود تو اپنی قدر کا احساس ہونا چاہیے؟“
 اس کے سوالیہ رک جانے پر خجستہ کچھ خفیف ہوئی۔ کچھ توقف کے بعد وہ کہہ رہا تھا۔
 ”مجھے آپ کے علاقے کا ایڈریس چاہیے۔ میرے پرنٹس ایک کوشش کرنا چاہتے ہیں۔“



ہادی نے جب خجستہ کا نام اپنے والدین کے آگے رکھا انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا صرف والد نے اتنا پوچھا تھا۔

”اطہر کی کلاس فیلو؟ جو ٹوٹلی ڈسٹنکشن ہے۔“

ہادی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”گولڈ میڈلیسٹ ہماری بہو بنے ہمارے لیے اعزاز کی بات ہوگی۔“

باپ کا سراہنا اطہر کو بھنا گیا، اسے سمجھ نہیں لگی کس طرح وہ پینڈو ہادی کے دماغ سے مٹائے۔

”جی بالکل۔ اس کے اعزاز میں پہاڑی جھلا کا پورا خاندان بھی شامل ہے، وہ بھی یاد رکھیے گا۔“

”اطہر۔“ اس کے باپ نے سرزنش کی۔ ”زندگی ہادی نے گزارنی ہے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں، تمہیں بھی نہیں ہونا چاہیے۔“ پھر ہادی سے کہا۔ ”تم ایڈریس لو، ہم ضرور جائیں گے۔“

اتنا تو اسے پتا تھا وہ انک کے قریبی علاقے سے ہے لیکن ایڈریس لینے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اب موقع ملتے ہی اس نے مانگا، وہ تحیر سے اسے دیکھتی رہی۔

”خجستہ۔ ابھی سر عارف کیا بتا کر گئے ہیں، ہمارے ہاتھ، دماغ، آنکھیں بہت قیمتی ہیں۔ یہ اتنے بے مول نہیں ہیں، ان کی کوئی قیمت نہ لگے، میں نے آپ کا کزن دیکھا ہے، وہ اس قابل نہیں کہ آپ کی قدر جان سکے، میں آپ کو آپ ہی کے ہاتھوں ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا، پلیز پلیز۔ ایک کوشش کر لینے دیں، پھر جو ہماری تقدیر رنگ دکھائے، مجھے منظور ہے۔“

ہونٹ اندر کی جانب بھیجنے وہ سکتے کی صورت اسے دیکھے گئی، پھر بنا کچھ بولے وہاں سے اٹھ کر وارڈ کی جانب بڑھنے لگی۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے۔“

”جب سوال کا جواب خاموشی ہو تو سمجھ جانا چاہیے۔“ کہہ کر وہ رکی نہیں۔



اس کے اندر کی تھی جنگ میں ایک بار پھر سے اس نے گولہ گرا تھا جس سے وہ اچھی خاصی درہم برہم ہوئی تھی مگر کسی پر ظاہر ہونے نہیں دیا، یہاں تک کہ اس کی ابھی کیفیت پر کئی بار بریرہ نے کریدا۔ وہ ہنس کر ٹال گئی، گھر سے الگ فون آتے رہتے، مرتیں ہو گئیں، پینٹ ہو گئے، کس کے کپڑے آگئے، کس کے سل گئے، اسے کسی چیز میں دلچسپی نہیں رہی تھی سوائے اس کے وقت یہاں ہی قلم جائے۔

انہی دنوں تعلیمی اداروں کے بارے میں عجیب سی خبریں آنے لگی تھیں۔ ان میں صداقت تو کیا تھی البتہ جھٹلو نے اپنا پیٹ بھرنے کو خوب اچھا لگا تھا کہ تعلیمی ادارے خاص کر میڈیکل کالجز منشیات فروشی میں سرگرم ہیں۔ یہ بات یہاں تک سہی تھی ڈاکٹر زکی رگوں میں خون سے زیادہ چائے کافی دوڑتی ہے، اسے نشہ کہا جائے یا ضرورت، جس طرح کی پڑھائی ہے، اس میں ایسا ہونا اتنا معیوب بھی نہیں۔ آخر انہوں نے بھی اپنے اعصاب ریلیکس کرنے ہیں لیکن اسے منشیات سے ملا دینا سراسر غلط ہے۔ کالج میں کانوکیشن کی تیاری عروج پر تھی، پرنسپل نے اسی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف میڈیکل کالجز کے ساتھ ایک مشترکہ کانفرنس بھی رکھ دی جس کا مقصد اس شعبے کا تقدس اور اعتماد کی پامالی کی مذمت تھا، پانچوں سالوں کے بچوں کے لیے چھوٹے چھوٹے مقابلے ترتیب دیئے گئے، تقاریر، کالم، چھوٹے سے خاکے، فرسٹ ایئر کی بچیوں نے اس ٹاپک پر پوسٹر تیار کئے تھے۔ جختہ کی ڈرائنگ بہت اچھی تھی۔ اس کی پریکٹیکل کاپی ہمیشہ سراہی گئی۔ ان بچیوں کو جانے کس نے مشورہ دیا تھا۔

”ڈاکٹر جختہ کو چیک کروالو۔“

اور جختہ کی عادت اتنی نرم تھی، کبھی کسی جو نیز کو اس سے کچھ بھی پوچھتے ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ اکثر ہی بچوں کو آن لائن لیکچرز کی ویب سائٹ بھیجتی رہتی تھی۔ اسی لیے دولڑکیاں بلا جھجک اپنا پوسٹر لیے اس کے پاس آ گئیں۔

”ڈاکٹر جختہ! کیا یہ ہم نے صحیح بنایا ہے؟“

اس نے پوسٹر کا تنقیدی جائزہ لیا۔ وہ لنگو (پھیپھڑوں) کا پوسٹر تھا ایک ڈرگ لینے کی وجہ سے سیاہی مائل بیمار

زدہ، دوسرا تازہ ہوا کے سبب تروتازہ گلابی سا۔ اس پر عام سی کوئیشن لکھ دی تھی۔

”فیصلہ آپ کا۔“ جختہ نے ایک دو جگہ سے ڈرائنگ صاف کر کے ٹھیک کی، بریرہ نے یک دم مشورہ دیا تھا۔
”جختہ! اگر ڈرگ والے میں ریئل سگریٹ چپکا دیں، پوسٹر کمال لگے گا۔“

مریم اور ردانے فوراً قوالوں کی طرح تائیدی سر دھنا، جختہ چائے کے سیپ لیتی اثبات میں سر ہلاتے کہنے لگی۔

”لیکن اس وقت سگریٹ کہاں سے آئیں گے، ہم ابھی تو آئے ہیں ہاسپٹل سے پہلے پتا ہوتا کہیں سے لے ہی آتے۔“

پانچ بجے کے بعد عام بچوں کو وارڈن گیٹ سے باہر قدم نہ رکھنے دے سوائے ہاؤس جاب والوں کے، وہ آرام کرنے تو ہاسٹل آئی تھی، باہر جانے کے خیال سے بھی کوفت ہونے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ فرسٹ ایئر کی بچی نے فوراً کہا تھا۔

”میم! میں اپنے سی آر کو فون کروں۔ شاید وہ لا دے۔“

جختہ نے لمحہ بھر سوچا پھر اپنا فون اٹھاتے کہا تھا۔

”ڈاکٹر ہادی ہاسپٹل میں تھے، ان سے پوچھتی ہوں شاید دے جائیں۔“

ایک دو تین کتنی بیل جاتی رہیں، فون رسیو نہیں ہو رہا تھا، ہوتا بھی کیسے وہ سینئر ڈاکٹرز کے ساتھ اوٹی (آپریشن تھیٹر) میں مصروف تھا۔ اس نے بچی سے ہی کہا۔

”چلیں آپ سی آر سے ہی کہہ دیں۔“

قسمت آج جختہ پر مہربان نہیں تھی شاید اسی لیے اس بچی کے موبائل میں بیلنس نہ ہونے کے سبب اس نے جختہ کا فون استعمال کیا تھا۔ سی آر سنتے ہی ہونق زدہ سا بولا۔

”سگریٹ۔ تم لوگوں نے سگریٹ کیا کرنی ہے، گرلز ہوسٹل میں آخر ہونے کیا لگا ہے؟ دماغ ٹھکانے ہیں، صبح میڈ کون (میڈیکل کانفرنس) ہے، پرنسپل تمہارے پر نچے اڑا دے گا۔ پہلے ہی میڈیکل کالجز کی بدنامی ہو رہی ہے۔“

”اوہو! ہمیں چاہئیں اور وہ بھی دوڑیاں، کسی بھی طرح، ابھی، اسی وقت۔“

سی آر کا دل کیا کچھ ملا کر دے آئے اچھا ہے ٹن ہو کر پڑی رہیں گی۔ بڑی چپیں چپیں کرتیں ہیں کلاس میں، میڈکون میں بھی انہوں نے کھپ ہی ڈالنی ہے، مگر پریشانی تھی آخر انہیں بیٹھے بٹھائے سو جھی کیا سگریٹ پینے کی، خجستہ نے فون لے کر انہیں سب بتا ہی دیا۔ وہ فوراً ادب سے بولا تھا۔

”جی جی ڈاکٹر خجستہ۔ ہم کسی طرح اریخ کرتے ہیں۔“

رات کے اس پہر کیا، دن میں اجازت نہیں ہے لڑکے گریڈ ہاسٹل میں قدم رکھ دیں، انہیں کبھی سمجھ نہ لگتی کس طرح سگریٹ ان تک پہنچائیں۔ اگر قدرتی طور پر ڈاکٹر اطہر میڈکون کے سلسلے میں ان کے پاس کچھ ماڈلز چیک کرنے نہ آئے ہوتے، خجستہ کے نام پر چونکے اور رک کر پوری بات سنی۔

”ہاں تو یہ کون سا مشکل ہے، آپ لوگ کلاس فیلوز ہو کام آنا چاہیے۔“

پھر کچھ سوچ کر ”لیکن تم لڑکے ہو کام کے بدلے، کچھ رعب تو دکھاؤ۔ چلو ان سے کہو، جس کے فون سے آرڈر ہوا ہے، وہ خود گیٹ پر لینے آئے۔“

فرسٹ ایئر کا بچہ ہچکچا کر بولا۔ ”بھائی وہ سینئر ہیں، ہم کیسے کہہ سکتے ہیں۔“

”جیسے اس نے آرڈر دیا ہے، رعب سے کہو شاہاش۔ اور کون سا گیٹ سے باہر آنا ہے، صرف اندر رسیو کرنا ہے۔“

بچے نے ڈرتے ڈرتے کہا تو خجستہ سن کر ہنس دی۔ ”اچھا چلو وہ لائیں تو سہی، میں جاتی ہوں۔“



وہ موبائل پر کچھ ٹائپ کرتی ہوٹل گیٹ کی جانب بڑھ رہی تھی، گیٹ کیپر ایک بیک ہاتھ میں پکڑے گیٹ کے اندر کی سمت کھڑا تھا۔ فرسٹ ایئر کے لڑکے ایک کالج بیک اسے یہ کہہ کر پکڑا گئے تھے۔

”اے بلاک، روم نمبر نائن کی ڈاکٹر خجستہ کا بیک کالج رہ گیا تھا، یہ انہیں دینا ہے۔“

گیٹ کیپر نے کھول کر اوپر اوپر سے اندر جھانکا۔ اسٹیٹھیو اسکوپ، بی پی آپریٹر، اوور آل، ایک دوکاپی، اس نے بیک بند کیا، تب ہی خجستہ سامنے سے آتی دکھائی دی۔

”انکل میرا کچھ سامان آنا تھا؟“

کیپر نے بیگ اس کی جانب بڑھایا۔ وہ شکریہ ادا کر مڑی تھی اسی وقت ڈاکٹر ہادی کی کال آگئی۔ انہوں نے چھوٹے ہی پوچھا تھا۔

”آپ کال کر رہی تھیں۔ خیریت؟“

”جی جی وہ۔“ اس کی وضاحت بیچ میں رہ گئی تھی کہ وارڈن تیز تیز اس کی جانب بڑھتے قدرے زور سے بولی تھی۔

”کیپر سے کیا لیا ہے آپ نے؟“

”میم یہ بیگ ہاسپٹل رہ گیا تھا۔“ اس نے فون نیچے کرتے ہوئے جھوٹ کا سہارا لیا۔

”ادھر دکھائیں۔“

اس نے آگے بڑھ کر ایک دم اس کے ہاتھ سے کھینچا۔ ”جستہ“ وہ، وہ میم۔“ کرتی رہ گئی ادھر ہادی پوچھ رہا تھا۔

”کیا ہوا ڈاکٹر جستہ۔“

وارڈن نے سیکنڈوں میں زپ کھول چیزیں نکالیں۔ اور آل کھینچتے ہی سگریٹ کی ڈبیاں دھپ سے باہر گریں۔ اس کی کوئی وضاحت سنے بنا وارڈن زور زور سے چلانے لگی۔

”کیا ہے یہ۔ تم ڈرگ سپلائی کر رہی ہو ہوٹل میں، پھر کہتے ہیں میڈیکل کے خلاف پراپیگنڈا ہوتا ہے۔ ابھی پرنسپل سے بات کرتی ہوں۔“

”خدا کے لیے میڈم میری بات سنیں۔“ اس کے زور سے چلانے پر وہ اور زور سے بولی۔

”اب جو سننا سنا ہے، اپنے پرنسپل اور پولیس کو سنانا۔“

پولیس کے نام پر اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ گئیں۔ اس کی کوئی بھی بات سنے بنا وارڈن پرنسپل کو کال کر چکی تھی، وارڈن کی کبھی ان لڑکیوں سے نہیں بنی تھی۔ اپنے زمانے میں میڈیکل کا میرٹ نہ بننے پر ان کے دل کا کلک آج تک نہ جاسکا تھا، وہ تو موقع کی تلاش میں ہوتی کسی طرح میڈیکل والوں کو ذلیل کر کے اپنے جلع دل

پر پھوار ڈالیں، اب تو موقع ہی اتنا اچھا تھا، ایک طرف کانفرنس، دوسری جانب ڈرگز اور وہ بھی ایک پٹھان ڈاکٹر کے ہاتھوں، کم از کم ان پٹھانوں پر تو لگے نہ پابندی آجاتے ہیں سیٹیں روکنے، اور ڈاکٹر بخستہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی ادھر ہادی پریشان تھا ہوا کیا؟

گرلز ہوسٹل سے ڈرگ پکڑی جانا معمولی بات نہیں تھی۔ پرنسپل ہاسٹل سے خاصے فاصلے پر تھے انہوں نے اسی وقت تین چار ایچ او ڈی کو گرلز ہاسٹل بھیجا تھا، ڈاکٹر ہادی بھی ان کے ساتھ ہونے کے سبب آگئے، اسے اطہر گیٹ سے کچھ فاصلے پر ملا تھا اور استہزائیہ سرگوشی کی تھی۔

”سنا ہے تمہاری لور ڈرگ سپلائی کرتی پکڑی گئی، خوب اپنے علاقے کے کاروبار کی نمائندگی کر رہی ہے۔“ ہادی نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ ویسے تو اطہر کو کوئی اندر گھسنے نہ دیتا، بڑی عمر کے ڈاکٹر کی ٹیم کے ساتھ چلتے ہادی سے باتیں کرتے وہ بھی ساتھ لگ گیا تھا، کپہر نے گیٹ تو کیا کھولا ادب سے چلتا انہیں وارڈن آفس تک لے گیا۔



بخستہ سر ہاتھوں میں گرائے خاموش بیٹھی تھی باقی لڑکیاں وضاحتیں دے رہی تھیں وارڈن ایسے بیٹھی تھی جیسے اسے سنائی نہ دیتا ہو ڈاکٹر کے داخل ہوتے ہی یک دم سکوت سا چھایا۔

”اور کس کس کو اطلاع دی ہے، آپ نے؟“

نیورو کے ایچ او ڈی اتنی زور سے بولے تھے، وارڈن اگر کرسی کا بازو نہ پکڑتی تو نیچے ہی گرتی جس طرح وہ اچھلی تھی۔

”صرف پرنسپل کو۔“ آواز کپکپا گئی

”بخستہ میری اسٹوڈنٹ ہے، پھر مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا، کیا میرا نمبر نہیں ہے آپ کے پاس۔“ ان کا غصہ عروج پر تھا اور وارڈن کے بعد جب بخستہ نے ساری بات بتائی ان کی گہری رنگت تانبے کی مانند تھی تھی، فرسٹ ایئر کے سی آر کو بھی فوراً تحقیق کے لیے ادھر بلوایا تھا۔

”لیکن اس کا کیا ثبوت ہے، وہ پوسٹر پر لگانی تھیں اور بخستہ تو جس علاقے سے ہیں، ان کا تو کاروبار ہی یہ

”ہے۔“

خجستہ نے میکا کی انداز میں نگاہ اٹھائی تھی۔ یک لخت بہت سی تندی اس میں جھلکی۔ سب کچھ ایک طرف اپنے علاقے کی بے حرمتی اسے گوارا نہیں تھی۔ اطہر نے بھی معنی خیز ہادی کو دیکھا تھا، جیسے کہا ہو ”ہوئی تسلی، متوقع سرالیوں کے کاروبار کی۔“

وارڈن کے جملے پر تمام ایچ۔او۔ڈیز کے چہرے سرخی سے دہک گئے۔
”ہوش میں ہیں آپ۔ تعلیمی ادارے میں بیٹھ کر تعصب پھیلارہی ہیں۔“
وارڈن فوراً سنبھلی۔

”نہیں، میرا مطلب تھا کہ منگوانے سے پہلے مجھ سے اجازت لینی چاہیے تھی۔ آخر میں ذمہ دار ہوں ان بچیوں کی، پوچھ گچھ مجھ سے ہی ہوگی نا۔“

پہلے خجستہ کو پھر اپنے دفاع میں بولتی وارڈن کو ایچ او ڈی نے گھر کا۔
”پہلے آپ بتائیں، آپ کو الہام ہوا تھا، بیک میں کچھ ہے۔“

”سر مجھے کال آئی تھی۔“ وہ جلدی سے اپنے موبائل میں کال لاگز چیک کرنے لگی، سی آر جیسے ہی ڈبیاں بیک میں ڈال کر باہر نکلا، اطہر نے اپنا نام لیے بنا وارڈن کو انفارم کیا تھا۔ بات ساری واضح ہو چکی تھی لیکن انہیں رہ رہ کر خجستہ پر غصہ آرہا تھا۔

”پوسٹر فرسٹ ایئر کا ہے، آپ کیوں گئیں یہ لینے۔“

خجستہ کے بولنے سے پہلے ہی فرسٹ ایئر کی لڑکی ہاتھ مسلتے منمنائی تھی۔ ”سراسی آر نے کہا تھا۔ جس نے آرڈر دیا وہ رسیو کرنے آئے۔“

سننے ہی سی آر کو کانوں سے دھواں نکلتا محسوس ہوا اور نگاہ ڈاکٹر اطہر کی جانب اٹھی۔ اطہر کو بھی امید نہیں تھی وہ اس کا نام لے دیں گے مگر اس وقت ایچ او ڈی کا غصہ قیامت سا سماں پھیلارہا تھا، سب کو اپنی پڑی تھی۔

”ڈاکٹر اطہر کا مشورہ تھا۔“

سب کی میکا کی انداز میں نظر اطہر پر اٹھی۔ سبز آنکھوں میں بے یقینی کا پانی اٹھ آیا۔ کیا کوئی اتنا بھی گر سکتا ہے

آخر کو کلاس فیلوز تھے، ہادی کی مٹھی سختی سے بھنچی گئی، جو جملے کچھ دیر پہلے اس نے استہزا میں بولے تھے وہ ہادی کے کانوں میں بجنے لگے۔ ہادی کے ہاتھوں کی رگیں تن کر ابھر آئیں۔ ایچ اوڈی کی نگاہوں کی تندہی ہی کافی تھی اطہر کی جان نکالنے کے لیے۔ اس نے مکتے ہوئے سی آر کو ڈپٹنا شروع کیا ہی تھا جب ایچ اوڈی نے وارڈن سے نمبر لے کر اپنے موبائل میں ڈالنا شروع کیا۔ پہلے ہند سے سے ہی اطہر کا نام اسکین ہوا، ہند سے پورے ہونے تک اسی کا نام رہ گیا تھا، جلدی میں اس سے یہی غلطی ہوئی تھی اپنے ہی نمبر سے کال کر دی۔ ایچ اوڈی نے اس کے ساتھ جو کرنی تھی سو کرنی تھی البتہ کمرے سے نکلتے ہادی کا ہاتھ بے اختیار اٹھا اس کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔

”I am ashamed of being your brother“ (مجھے تمہارا بھائی ہونے پر شرم آرہی ہے)۔“

بخستہ کو ایچ اوڈی نے اشارے سے باہر جانے کا کہا۔ سب بچے ایک ایک کر کے باہر نکل گئے تھے، خود انہوں نے بہت دیر اطہر کی کلاس لی تھی یہ وہ ہی جانتا تھا اور تاحیات بھولنے والی کلاس نہیں تھی وہ۔



وہ رات اسے اپنی زندگی کی بہت سیاہ رات لگی تھی۔ وہ جانتی تھی اس نے حیثیت سے بڑھ کر خواب دیکھ لیے ہیں لیکن ان خوابوں کی پامالی، اتنا بڑا الزام، پہلے چیٹنگ، اب ڈرگ سپلائی اور پھر وہ زمین جس پر اس نے چلنا بھاگنا سیکھا، اتنے لوگوں میں اس کی بے عزتی، یہ حیثیت دی خاندانی ڈگری ہولڈر نے۔ کل ہونے والی تقریب کی ساری خوشی آنسوؤں میں سیلی محسوس ہوئی۔ وہ کمرے سے نکل کر کوریڈور میں آ بیٹھی۔ رات کے سنائے کو چیرتی جھنگروں کی آوازوں میں کئی دن پہلے ہونے والی داجی کی ٹیلی فونک گفتگو آج صبح سنائی دے رہی تھی۔

”بخستہ بچے! جب تم آئے گا حیران رہ جائے گا، بڑا کام کیا ہم نے یہاں۔“

”ایسا کیا کر دیا داجی۔“

”اس پاگل کے بچے کو سیدھا کر دیا ہے۔ صبح ہی نکل جاتا ہے۔ پہاڑ سے پچھلی زمین پر رات کو بلب، لائٹنیں جلا کر کام پورا کر دیا ہے۔۔ کہتا ہے، میں بھی پڑھوں گا، بخستہ جتنا نہ سہی مگر کچھ تو آگے بڑھوں۔ اب

دیکھو، دس بج گئے، ابھی تک نہیں آیا، زودور بھی اسے گالیاں دیتا ہوگا۔ ہاہاہا۔“

پھر انکا اونچا قہقہہ تھا۔ اس وقت وہ قہقہہ اسے اپنے مستقبل کا مذاق اڑاتا لگا تھا، لیکن اس وقت شیشے کی ونڈو کے پار دکھائی دیتی سیاہی میں نو تعمیراتی عمارت کا ڈھانچہ نظر آ رہا تھا، جس میں کہیں کہیں زرد بلب جل رہے تھے، سرخ اناری گالوں پر بہتے پانی کی دھار اس نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے پونچھی، اپنے موبائل سے ایک کال کر کے واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔



عام سادہ بہت خاص بن گیا تھا۔ پورا کالج ایسے لشک رہا تھا جیسے اس علاقے میں عید کا سماں ہوا ہو۔ گراؤنڈز میں میڈیسنز اور آلات جراحی کی بیشتر کمپنیوں نے جا بجا اسٹال لگا رکھے تھے، حفظانِ صحت، وائرس سے بچاؤ، صاف پانی پر بڑے بڑے بینرز کے بیچ کالج کا آفیشل جھنڈا لہر رہا تھا، چہار اطراف سفید کوٹ میں ملبوس تیز قدموں کی تمکنت نے ایسا سماں باندھا تھا چھوٹا سا بچہ بھی دیکھ لے تو اس ماحول کا حصہ بننے کی اسی دن سے تمنا کرے۔

سیدھی کمر، گردن اٹھائے سفید کوٹ والوں سے ایڈیٹوریم فل ہوتے ہی پروڈاکٹ تقریب کا آغاز ہوا۔ چھوٹے چھوٹے مقابلوں کے بیچ جب ڈگریوں کی تقسیم پر اعلان شروع ہوئے۔ پہلا نام جو مائیک میں گونجا تھا نہ صرف پرنسپل کا سر فخر سے اٹھا، بلکہ پورا U.H.S کا وفد اعزازی تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔ اعلان بار بار ہو رہا تھا۔

”ڈاکٹر خجستہ جمال خان۔ ڈاکٹر خجستہ جمال خان۔۔ پلیز کم آن دی اسٹیج۔ پلیز۔“

اسٹیج کے پیچھے پوری دیوار جتنی پروجیکٹر اسکرین نصب تھی، جس پر ڈاکٹر خجستہ کے تعلیمی کامیابیوں کی فہرست چل رہی تھی، میڈیکل کالج کے مختلف موقعوں پر لی گئی تصاویر ترتیب سے اسکرین پر چلنے لگیں، کہیں کوئی انعام لیتے، کہیں کوئی اعزازی سند وصول کرتے، کوئی میڈل گلے میں پہناتے، اور روسٹم پر کھڑے کمپیئر مسلسل نام پکار رہے تھے۔

”ڈاکٹر خجستہ کم آن دی اسٹیج۔“

گونج میں کوئی چاپ نہیں ابھری تھی۔ متلاشی نگاہوں کے ساتھ گردنیں بھی ادھر ادھر گھومیں، ایک سال میں

ڈسٹنشن لینے والوں کے دل کی دھڑکن اتنی تیز تھی کب ہمارے میڈل کا اعلان ہوگا، کب اسٹیج پر جائیں گے، جو پانچوں سال میں ڈسٹنشن لے، جس کے لیے مہمان خصوصی پر سٹی انعام لے کر بیٹھا ہو، وہ تقریب میں غیر حاضر؟ وہ نہ تو کسی کو ہرانے آئی تھی نہ ہی جیتنے، بس اسے تو سنگلاخ پتھروں پر مرہم رکھنے تھے۔ اس تقریب کی ساری خوشی رات لگے بے بنیاد الزام میں کافور ہوئی، خود پر بجنے والی تالی کی خواہش نے دل میں دم ہی توڑ دیا تھا، میڈلز اور ڈگری تو بعد میں آفس سے بھی لی جاسکتی تھی پھر اس تقریب میں خود پر تالیاں بجوا کر کیا الگ مل جانا تھا، وہ اس میں سرے سے آئی ہی نہیں، حاضرین کی بے چینی، چہ میگوئیاں روکنے کے لیے اسپیکر میں دوسرے نام گونجنے لگے، ڈاکٹر ہادی خاموشی سے اٹھ کر دروازے کی سمت بڑھا اور اس کے سیل پر کال ملاتے باہر نکل آیا۔

فون پر مسلسل بیل جا رہی تھی مگر رسیو نہیں ہو رہا تھا۔ ہادی کی جھنجھلاہٹ میں پریشانی گھل گئی۔ اس کے قدم خود بخود گرلز ہوٹل کی جانب بڑھنے لگے۔ وہ ابھی کچھ فاصلے پر تھا سیاہ چادر میں لپٹی تجستہ ہینڈ بیگ کہنی میں ڈالے اپنا ٹرائی بیک گھسیٹتے کالج کے ٹیکسی اسٹینڈ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

”کہاں جا رہی ہیں آپ؟“

”جہاں سے آئی تھی، وہاں۔“ بنا کر بولی تھی۔

”سب بیچ میں چھوڑ کر، ایسے کیسے جاسکتی ہیں۔ میرا مطلب وہ کالوئیکشن؟“

وہ رکی، مڑی اور ٹھوس لہجے میں بولی۔

”جس مقصد کو آئی تھی وہ پورا ہو چکا ہے۔ ڈگری میں رسیو کر لوں گی نوپرا بلیم۔“

”لیکن.....“

اُس کے لہجے میں کوئی التجاسی ابھری۔ کل جو کچھ ہوا میں اس کی معذرت کرتا ہوں، بہت مین حرکت کی اطہر نے لیکن ایک کی سزا دوسرے کو کیسے دے سکتی ہیں آپ، ڈاکٹر تجستہ۔“

اس نے ٹرائی بیک کا ہینڈل چھوڑ کر بازو سینے پر لپیٹے، اٹل انداز میں بولی تھی۔

”دیکھیں ڈاکٹر ہادی! میں ایک پہاڑی لڑکی ہوں، وہ پہاڑ جو زمین کی میخیں ہیں۔ یہ پہاڑ اپنے سلسلوں میں ہی قیمتی رہتے ہیں، سلسلوں سے ہٹی پہاڑیاں لوگوں کے لیے ایک تفریحی مقام سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور آپ

تو جانتے ہی ہیں تفریحی مقام پر گند ڈالنا بھی ہمارا ایک کلچر ہے۔“ وہ چند پل چپ رہ کر اسے دیکھنے لگی پھر مضبوطی سے بولی تھی۔ ”ہم پٹھان سب برداشت کر لیتے ہیں لیکن کوئی ہماری ماں کو گالی نکالے ہم نہیں بھولتے، کل میرے علاقے کو گالی نکالی گئی ہے۔“

اس نے بمشکل سانس کھینچی اور تلخ انداز میں بازو کھول کر اپنے بیک کا ہینڈل تھاما، چادر ماتھے کی جانب سرکائی۔ ”اور رہی بات ڈاکٹر اطہر کی، تو انہیں شکریہ ادا کر دیجیے گا، فیصلہ کرنے میں انہوں نے آسانی کر دی۔ انہیں میرا پیغام دے دیجئے گا، پٹھان سب ہو سکتے ہیں بے غیرت نہیں۔ اور رہی آپ کی بات، تو..... آپ جیسے قابل ڈاکٹر کو بہت سی خجستہ مل جائیں گی، لیکن ان پہاڑوں پر رہ جانے والی تمام خجستہ کے آگے میرا خود غرض فیصلہ دیوار چن دے گا۔ مجھے اپنی نسل کے آگے دیوار نہیں چھنی۔ سو پلیز۔“

وہ بیک گھسیٹتی تیز تیز آگے کو بڑھی، پہیوں کی رگڑ ہادی کو اپنے دل پر محسوس ہوئی تھی، ٹیکسی اسٹینڈ پر امروز لالہ اس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ وہ رات ہی انہیں آنے کا کہہ چکی تھی۔ ہادی کا جی چاہا وہ آگے بڑھے، لالہ سے ان کے گھر کا ایڈریس پوچھے، اپنا بتائے مگر پاؤں زمین سے چپک سے گئے تھے اور ٹیکسی گرداڑاتی نگاہوں سے دور بھاگتی جا رہی تھی۔ اڑتی گرد کے ان زروں میں ہادی کو نہیں لگتا تھا وہ کبھی ان سے اپنی جان چھڑا پائے گا۔ خوش بختی کی علامت خجستہ کہیں اندر تک جگہ بنا چکی تھی۔

..... ختم شد ❁